حق الیقین

از

سیدنا حضرت میرزا بشیرالدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ ـــــ ھُوَ النَّاصِرُ

حق الیقین

(رقم فرمودہ ۱۹۲۶ء)

ایک کتاب مُسمّٰی بہ ھَفَوَاتُ الْمُسْلِمِیْنَ[1] فِیْ تَفْضِیْحِ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَ تَقْبِیْحِ اُمَّھَاتِ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ کُتُبِ الْمُؤَرِّخِیْنَ وَالْمُفَسِّرِیْنَ وَالْمُحَدِّثِیْنَ حال ہی میں ایک صاحب کی طرف سے جن کا نام مرزا احمد سلطان ہے لکھنؤ کے مطبع نور المطابع سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف کا منشاء اس دل آزار اور سب و شتم سے پُر کتاب کے شائع کرنے سے ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ:

"مذہب اہل سنت کی کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جس میں خدا و انبیاء و رُسل کی تفضیح نہ ہو اور سب سے زیادہ تفضیح حضور سید المرسلین و امہات المؤمنین کی کتب اسلامی میں ہے لیکن ان جملہ تفضیحات میں حضور سید المرسلین و امہات المؤمنین کی تفضیحات و تقبیحات نہائت روح فرسا اور بیخ کن اسلام ہیں اس لئے ان دو قسموں کی احادیث کے تھوڑے تھوڑے نمونے اس غرض سے پیش کئے جاتے ہیں کہ ہمارے غیور مسلمان ان احادیث واہیہ و روایات کاذبہ کو کتب اسلامی سے خارج فرما کر خدا اور رسول کی خوشنودی کا پروانہ حاصل کریں۔ چونکہ وہ موضوعہ عبارات بزرگان دین و معتبران اسلام کے نام نامی سے احادیث مشہور کر دی گئی ہیں اس لئے ہفوات امام بخاری اور بالخصوص خاتمہ کتاب ھٰذا سے ثابت کر دیا گیا ہے کہ ایسی جملہ احادیث دشمنان رسول و معاندان امہات المؤمنین کے تحائف ہیں جن کو نامحقق محدثین نے

منقولات اسلاف کے نام نامی سے دھوکا کھا کر اپنی اپنی جامع ومسانید وصحاح وسنن و معاجم میں درج کر لیا ہے پس ان کے اِخراج واِحکاک واِحراق کرنے میں اجر عظیم اور ثواب فخیم ہے"۔ ہفوات صفحہ ۲۔

اس تحریر اور خصوصاً طرز بیان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مصنف ہفوات کا منشاء اس کتاب کی تصنیف سے حق جوئی اور صداقت طلبی نہیں ہے بلکہ پردہ پردہ میں آئمہ اسلام اور بزرگان دین کو گالیاں دینا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس تصنیف کے اصل مخاطب اہل حدیث صاحبان ہیں اور اگر وہی مسلک ہم اختیار کرتے جو وہ لوگ ہمارے متعلق اختیار کیا کرتے ہیں تو شائد ہمارا طریق بھی یہ ہوتا کہ ہم اس جنگ کا لطف دیکھتے اور ایک دوسرے کی فضیحت اور تحقیر کو خاموشی سے ملاحظہ کرتے لیکن چونکہ ہمارا رویہ تقویٰ پر مبنی ہے اور اسلام کی محافظت اور اس کے خزائن کی نگرانی کا کام ہمارے سپرد کیا گیا ہے اس لئے میری غیرت نے برداشت نہ کیا کہ یہ کتاب بلاجواب کے رہے اور اسلام کے چھپے دشمن اسلام کے ظاہری دشمنوں کے ساتھ مل کر اس کے اندر رخنہ اندازی کرنے کا کام بلا روک ٹوک کرتے چلے جائیں۔

کسی مذہب کی خوبی اس کے ثمرات سے پہچانی جاتی ہے حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

"ہر ایک اچھا درخت اچھا پھل لاتا ہے اور بُرا درخت بُرا پھل لاتا ہے۔ اچھا درخت بُرا پھل نہیں لا سکتا نہ بُرا درخت اچھا پھل لا سکتا ہے۔ جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے پس ان کے پھلوں سے تم انہیں پہچان لوگے"۔[۱]

اگر ایک شخص دنیا کی اصلاح اور اس کے درست کرنے لئے مامور ہونے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اس کی سب کوششیں اکارت جاتی ہیں اور وہ ایک ایسی جماعت چھوڑ جاتا ہے جو بے دین اور منافق اور خدا سے دور ہوتی ہے تو یقیناً اس کا دعویٰ باطل ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ ایک کام کے لئے بھیجے اور وہ اس کام میں ناکام ہو اس کی تربیت یافتہ اور صحبت سے مستفیض ہونے والی جماعت کا بیشتر حصہ اس کے اثر سے متاثر ہونا چاہئے اور اس کی تعلیم کا حامل اور عامل ہونا چاہئے ورنہ اس کی آمد فضول اور اس کی بعثت عبث ہو جاتی ہے۔ اسی طرح یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک نیک اور پاک جماعت کی تربیت کے ماتحت ایک ایسی جماعت پیدا ہو جائے جو بِلا تدریج شرارت اور فتنہ کا مجسم نمونہ بن جائے۔ ہمیشہ خرابی آہستگی سے پیدا ہوتی ہے جس قدر

جماعتیں دنیا میں خراب ہوئی ہیں تدریجاً ہی خراب ہوئی ہیں اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل کمزور ہوتے ہوتے آخر اسلاف کے اثر مٹ گئے ہیں۔

پس جو شخص یہ بتانا چاہتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور ان کے بعد خدمت اسلام کرنے والے لوگ درحقیقت منافقوں کی ایک جماعت تھی اور اسلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دم تک تھا یا آپ کے بعد آپ کے چند رشتہ داروں کے دلوں میں اس کا اثر محدود ہو گیا وہ یا تو قانون قدرت اور انبیاء کی شان سے بالکل ناواقف ہے یا پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پوشیدہ دشمن ہے کہ آپ کو ناکام اور نامراد ثابت کرنا چاہتا ہے اور اسلام کو ایک بے ثمر درخت اور بے اثر تعلیم بتا کر دشمنوں کو خوش کرنا اور اسلام کی وُقعت کو گرانا چاہتا ہے۔

دنیائے اسلام کا بیشتر حصہ ان احادیث پر اپنی بہت سی فقہ اور تفصیلات تعلیم کا انحصار رکھتا ہے اور گو اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر احادیث کی کتب نہ ہوتیں تو اسلام کا کوئی حصہ تو مخفی نہ رہتا لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر یہ کتب نہ ہوتیں تو اب جس طرح ایک تدبر کرنے والے انسان کے لئے اپنے آقا کے کلام میں اپنے تدبر کی تائید دیکھ کر ایک خوشی کا سامان پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو عالَم خیال میں اپنے محبوب کی مجلس ارشاد میں ہدایت کے موتی چُنتے ہوئے پاتا ہے وہ بات نہ رہتی۔ اسی طرح تاریخ اسلام کا ایک بیشتر حصہ بھی جو مُردہ روحوں کو تازہ کرنے والا اور صدیوں کے گزرنے پر بھی استاد اور شاگرد اور آقا اور غلام اور عکس اور ظل میں شدید اتّصال پیدا کرنے کا موجب ہے معدوم ہو جاتا۔ غرض تکمیل دین کے لئے گو احادیث کی ضرورت نہیں لیکن فقہ اور قیاس کی رہنمائی کرنے اور اطمینان قلب اور زیادتِ تعلق کے لئے وہ ایک بیش بہا ذریعہ ہیں اور سنت کے لئے بھی بطور گواہ ہیں کیونکہ گو سنت حدیث کی محتاج نہیں لاکھوں کروڑوں آدمیوں کا عمل اس پر شاہد ہے لیکن حدیث یہ گواہی تو ضرور دیتی ہے کہ سنت کا تواتر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا بھی ہے یا کوئی عمل اور طریق بعد کے لوگوں کا اختراع ہے مثلاً اس وقت کروڑوں مسلمان بدعات میں مبتلا ہیں اور وہ اپنے زعم باطل میں یہی سمجھ رہے ہیں کہ یہ کلام اسلام کا جزو ہیں اور ہمیشہ سے ہوتے چلے آئے ہیں حدیث ہمیں اس امر میں مدد دیتی ہے کہ یہ خیالات بعد میں پیدا ہوئے ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ان کا پہنچنا تو الگ رہا اس زمانہ میں بھی ان رسوم کا مسلمانوں میں کچھ پتہ نہ تھا جب احادیث جمع کی جا رہی تھیں اور صاحب بصیرت کے لئے وہ موجب ہدایت ہو جاتی ہے جیسے اہل شیعہ میں تازیوں کی بد رسم ہے کہ

خود بڑے بڑے ائمہ اس رسم کرنا پسند کرتے ہیں ان کی ہدایت کا موجب وہ روایات ہی ہوتی ہیں جو احادیث کے نام سے مشہور ہیں اور انہیں سے معلوم کرتے ہیں کہ اس کا کام کا ثبوت ائمہ اہل بیت کے عمل سے نہیں ملتا اگر وہ روایات نہ ہوتیں تو وہ کیونکر سمجھتے کہ یہ کام حضرت امام زین العابدین کے زمانہ سے چلا آتا ہے یا بعد میں کسی تماش بین۔طبیعت نے ایجاد کر کے اپنے ہم مذاق لوگوں کی ہمدردی کو حاصل کر کے اس کا رواج عام کر دیا ہے۔

علم حدیث کا ایک اور فائدہ بھی ہے کہ یہ سنت کے متعلق ہمیں یہ علم بھی دیتا ہے کہ کونسی سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ مرغوب تھی۔ بے شک نسلاً بعد نسلٍ مسلمانوں کا طریق عمل اس امر کو تو ثابت کر سکتا تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کام کو کس طرح کیا یا کس کس طرح کیا لیکن یہ بات تواتر اور عمل سے نہیں معلوم ہو سکتی تھی کہ کئی طریقوں پر جو کام کیا گیا ہے ان میں سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زیادہ پسندیدہ کون سا طریق تھا یا کس طریق پر آپ خود اکثر عمل فرماتے تھے ایک سالک راہ کے لئے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق کے لئے یہ علم نہایت ہی دل کو تقویت دینے والا اور معلومات کے ذخیرہ کو بڑھانے والا ہے۔

علم حدیث کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے قرآن کریم کے وہ بہت سے معارف جسے ایک عام انسان خود نہیں معلوم کر سکتا تھا بلکہ اعلیٰ درجہ کی روحانیت کے حصول کے بغیر ان پر اطلاع ہی نہیں ہو سکتی تھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ظاہر کر دیئے گئے ہیں اور ہر ایک شخص ان سے فائدہ اٹھا کر قرآن پر تدبر کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے مثلاً قرآن کریم میں دوزخ کا عذاب ابدی قرار دیا گیا ہے مگر اسے غیر متناہی نہیں قرار دیا گیا لیکن عام طور پر لوگ اس امر کو نہیں سمجھ سکے اور انہوں نے قرآن کریم کی آیت رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ [۳] کی تہہ کو نہیں پایا۔ اور نہ أُمُّهُ هَاوِيَةٌ [۴] کی آیت پر غور کیا کہ کیا کوئی شخص ماں کے پیٹ میں ہمیشہ رہتا ہے اور نہ یہ سوچا کہ جنت کے انعامات کی نسبت کیوں باوجود ابد کے الفاظ استعمال ہونے کے غَيْرَ مَجْذُوْذٍ [۵] (نہ کٹنے والے) اور غَيْرُ مَمْنُوْنٍ [۶] (نہ کٹنے والے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور کیوں دوزخ کی نسبت یہ الفاظ استعمال نہیں ہوئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَيْسَ فِيْهَا اَحَدٌ [۷] فرما کر اس نکتہ معرفت کو جو سِرِّ خلق کی جان اور معرفت کی روح ہے ہر ایک شخص تک پہنچا دیا اب جو شخص ضد اور تعصب سے خالی ہو اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔

اسی طرح مثلاً قرآن کریم میں مسیح علیہ السلام کے ایک مثیل کی خبر سورۃ تحریم میں بایں الفاظ دی گئی تھی کہ وَضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَکَ بَیْتًا فِی الْجَنَّۃِ وَنَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِہٖ وَنَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۔ وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا فَنَفَخْنَا فِیْہِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِکَلِمٰتِ رَبِّھَا وَکُتُبِہٖ وَکَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ۔[8] یعنی مسلمانوں کی دو اقسام ہیں ایک تو وہ جو نیک تو ہوتے ہیں مگر کبھی بدی سے مغلوب بھی ہو جاتے ہیں اور ایک وہ جو بکلّی پاک ہوتے ہیں مگر اس سے اوپر ایک ترقی کا درجہ بیان فرمایا ہے کہ یہ پاک لوگ جب اللہ تعالیٰ کی وحی سے مشرّف ہوتے ہیں تو مریمی صفت سے ترقی کر کے اپنے اندر مردوں والی طاقت پیدا کر لیتے ہیں اور وہ درجہ مسیحیت کا درجہ ہے اور اس میں ایک مثیل مسیح کی خبر دی گئی ہے اسی طرح سورۃ زخرف کے چھٹے رکوع میں بیان فرمایا ہے وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْیَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُکَ مِنْہُ یَصِدُّوْنَ۔[9] جب ابن مریم کو بطور مثال کے بیان کیا جاتا ہے تو تیری قوم اس پر تالیاں پیٹتی ہے سوائے اس کے کہ ایک مسیح کی آمد کی خبر دی گئی ہے اور کبھی بھی مسیح علیہ السلام کو قرآن کریم یا حدیث میں بطور مثال نہیں پیش کیا گیا پس اس میں بھی ایک مسیح کے رنگ میں رنگین شخص کی آمد کی خبر دی گئی تھی مگر اس نکتہ کو وہی سمجھ سکتا تھا جو یا تو معرفت میں ترقی یافتہ ہو یا پھر خود اس زمانہ کو پالے جس کے متعلق یہ اخبار تھیں پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی ہدایت کے لئے ان الفاظ میں لوگوں کو خبر دے دی کہ آئندہ زمانہ میں مسیح کا نزول ہونے والا ہے اگر آپ نہ بتاتے تو عوام الناس اس موعود کی انتظار ہرگز نہ کرتے اور اس کے قبول کرنے کی طرف انہیں کوئی توجہ نہ ہوتی۔ غرض احادیث قرآن کریم کے دقیق مسائل کی وہ تفسیر بھی بیان کرتی ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ کیوں خود قرآن کریم نے اس مضمون کو اس طرز بیان نہ کر دیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض قلت تدبر کا نتیجہ ہے کیونکہ اگر اس اعتراض کی روح کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو تفاوت مدارج اور حقیقت تدبر بالکل باطل ہو جائے کئی لوگ اس قدر علم بھی نہیں رکھتے کہ ان معمولی باتوں کو سمجھ سکیں جن کو علوم ظاہری رکھنے والا آدمی بھی ادنیٰ تدبر سے سمجھ سکتا ہے لیکن جب وہ شخص ان اشخاص کو تفصیلاً سمجھاتا ہے تو وہ سمجھ لیتے ہیں تو کیا کہہ سکتے ہیں کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے اِنہیں الفاظ میں قرآن کریم کو نہ اتارا جن میں صافی یا رازی نے اس مطلب کو ادا کیا ہے تا کہ سب لوگ سمجھ سکتے۔ بے شک دوسرے انسانوں کے سمجھانے سے بعض

مطالب تو حل ہو جاتے ہیں لیکن اس قدر وسعت مطالب میں نہیں رہتی جو قرآن کے الفاظ میں پائی جاتی ہے۔

غرض یہ کہ احادیث کے مجموعہ سے اسلام کی ترقی میں اور روحانیت کی زیادتی میں بہت مدد ملی ہے اور اس کے فوائد بہت سے ہیں جن میں سے چند اوپر بیان کئے گئے ہیں اور ان کے فوائد کا انکار سوائے جاہل یا متعصب انسان کے اور کوئی شخص نہیں کر سکتا۔ اور جن لوگوں نے ان کو ضبط اور جمع کیا ہے وہ ہر ہی خواہ اسلام کے شکریہ اور دعا کے مستحق ہیں جَزَاھُمُ اللّٰہُ عَنَّا وَ عَنْ جَمِیْعِ الْمُسْلِمِیْنَ۔

احادیث کے متعلق یہ امر سمجھ لینا ضروری ہے کہ وہ انسانی کوشش کا نتیجہ ہیں جو صحیح حدیث ہے وہ خدا کے رسول کا قول ہے اور جو غلط ہے اس کی غلطی انسانی علم کی کمی کے سبب سے ہے نہ حدیث کے جمع کرنے والوں نے اپنی کوششوں کو غلطی سے پاک قرار دیا ہے اور نہ وہ غلطی سے پاک کبھی قرار دی گئی ہیں پس اسی حیثیت سے ان پر تنقید کرنی چاہئے کون سا کام انسان کا ہے جس میں غلطی نہیں ہوئی۔ پہلے زمانہ کے علوم کے بعض حصوں کو آج کی تحقیق نے باطل ثابت کر دیا ہے مگر اس سے ان علوم کے مدوّن کرنے والوں کی ذات پر کوئی حرف نہیں آتا۔ موجودہ طب خواہ یونانی ہو خواہ انگریزی اس طب سے ہزاروں گُنے بڑھ کر ہے جو آج سے پہلے دنیا میں مروج تھی اور آئندہ زمانہ کی ترقیات موجودہ زمانہ کی طب کو بھی پیچھے چھوڑ جائیں گی مگر باوجود اس کے ان لوگوں کے احسان اور ان کی شان میں ہرگز شبہ نہیں کیا جائے گا جنہوں نے آج سے دو ہزار سال پہلے طب کو مدوّن کیا۔ جالینوس [۱۰] کی سینکڑوں غلطیاں ثابت ہو جائیں پھر بھی وہ جالینوس کا جالینوس ہی رہے گا اور ہر علم دوست انسان اس کے احسان اور اس کے علم کی قدر کرے گا کیونکہ سوال یہ نہیں ہے کہ جالینوس کیا جانتا تھا بلکہ سوال یہ ہے کہ جالینوس نے علم میں کس قدر زیادتی کی اور آئندہ علوم کی ترقی میں کس قدر مدد کی۔ اگر اس کی سَو بات غلط ثابت ہو جائے تو ہو جائے مگر اس میں کیا شبہ ہے کہ اس نے بعض باتیں ایسی دریافت کیں کہ وہ آئندہ علوم کی ترقی کے لئے بنیاد ہو گئیں۔ پچھلی تحقیق بے شک اس کی تحقیق سے بڑھ کر ہے مگر اس کی تحقیق نہ ہوتی تو یہ بعد کی تحقیق بھی نہ ہوتی۔ سقراط [۱۱] اپنے علم الاخلاق کے سبب اور افلاطون [۱۲] اپنے فلسفہ کے سبب سے ہمیشہ یاد رکھے جاویں گے گو علم الاخلاق اور فلسفہ کس قدر ہی ترقی کیوں نہ کر جائیں اور نئی تحقیق ان کی تحقیقاتوں میں ہزاروں غلطیاں کیوں نہ ثابت کر دے کسی انسان پرستی کے سبب سے نہیں بلکہ اس

سبب سے کہ ان کا دماغ دوسروں کے لئے تحریک کا موجب بنا اور انہوں نے ایک ایسی بنیاد رکھی جس پر اور عمارتیں تیار ہوئیں۔ ایک تاریخی کتاب کا مصنف جو سال ہا سال کی عرق ریزی کے بعد ان واقعات کو جو پراگندہ طور پر ہزاروں دماغوں میں مخفی تھے یکجا اور ترتیب وار جمع کر کے ہر انسان کی پہنچ میں لے آتا ہے محض اس وجہ سے کہ اس کی تحقیق میں بعض غلطیاں رہ گئی ہیں اس شخص کی نسبت حقیر نہیں قرار دیا جا سکتا جس نے واقعات نہیں جمع کئے بلکہ مصنف کی کتاب کے کسی ایک واقع میں غلطی نکال دی ہے کیونکہ مصنف نے اگر بشریت کے ماتحت کوئی غلطی کر دی ہے تو اس نے ہزاروں جدید باتیں بھی تو ہمیں بتائی ہیں جو ہمیں پہلے معلوم نہ تھیں پھر کیا اس کی اس محنت کو ہم نظر انداز کر دیں گے اور اس کی غلطی کو جو محض بشریت سے واقعہ ہو گئی ہے اور جس قسم کی غلطیاں اگر ہم اس کام کو کرتے جو اس نے کیا ہے اور اس زمانہ میں کرتے جس میں اس نے وہ کام کیا ہے خود ہم سے نہ صرف یہ کہ واقعہ ہوتیں بلکہ شائد اس سے کئی گُنے زیادہ واقعہ ہو جاتیں اس قدر بڑھا بڑھا کر بیان کریں گے کہ اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیں گے یقیناً اگر ہم شرافت طبع کا کوئی حصہ اپنے اندر رکھتے ہیں تو ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔

اُسی وقت کسی کے کام پر اس کو ملامت کی جاتی ہے جب کہ اس کا کام بجائے مفید معلومات کا موجب ہونے کے، بجائے ترقی کی طرف لوگوں کا قدم اٹھانے کے لوگوں کے تباہ ہو جانے کا موجب ہوا ہو اور اُسی وقت ہم کسی کی غلطی پر لعنت و ملامت کرنے کے حق دار ہوتے ہیں جب کہ اس نے جان بوجھ کر لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہو یا ایک ایسی غلطی میں لوگوں کو ڈالا ہو جو اس زمانہ کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے معمولی کوشش اور سعی سے دور ہو سکتی تھی یا جب کہ وہ کسی ایسے امر کو جس میں غلطی کا احتمال ہو سکتا تھا اپنے زیر اثر لوگوں کے سامنے یہ کہہ کر پیش کرتا ہے کہ اس میں غلطی کا احتمال ہی بالکل ناممکن ہے اور یہ ایسا ہی غلطی سے پاک ہے جیسے کہ الہام الٰہی سے بتائی ہوئی تعلیم۔ ایسے شخص پر اس لئے ملامت کی جاتی ہے کہ وہ لوگوں کو علم سے محروم کرتا ہے لیکن محدثین نے ایسی کونسی بات کی ہے جس پر ان کو اس قدر گالیاں دی جائیں۔ کیا ان لوگوں کی محنت سے ہزاروں قسم کی بدعات کا قلع قمع نہیں ہوا؟ کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و وعظوں کا ایک ذخیرہ انہوں نے جمع نہیں کر دیا؟ کیا سنت کی حفاظت کا کام انہوں نے نہیں کیا؟ کیا علوم قرآنیہ کی ترویج اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فہم قرآن کی اشاعت میں انہوں نے مدد نہیں دی؟ کیا ایک اعلیٰ درجہ کی اسلامی تاریخ جس میں عام تاریخی تحقیقات سے بہت زیادہ محنت کے

ساتھ حالات جمع کئے گئے ہیں اور جس میں تاریخ سے بڑھ کر یہ جدّت ہے کہ بجائے اپنے الفاظ کے خود راوی کے الفاظ یا متکلّم کے الفاظ کو بیان کرنے کی حیرت انگیز حد تک کامیاب کوشش کی گئی ہے انہوں نے تیار نہیں کر دی؟ پھر اس بے نظیر کوشش کے صِلہ میں کیا ان کو وہی انعام ملنا چاہئے جو مصنّف کتاب نے ان کو دینا چاہا ہے۔ اور جس عطیہ پر صداقت اور احسان شناسی بآواز بلند "عطائے تُو بلقائے تُو" کے مقولہ سے اسے مخاطب کر رہی ہیں۔

وہ کونسا علم تھا جسے علم حدیث کے رواج سے نقصان پہنچا، یا وہ کونسی تحقیق تھی جو اس علم کی ایجاد کے بعد رُک گئی۔ اگر اس علم سے کوئی نقصان لوگوں کو پہنچا ہے تو اور کونسا علم ہے جس کا غلط استعمال لوگ نہیں کر لیتے۔ اگر علم حدیث کو بعض لوگوں نے تدبّر فی القرآن میں روک بنالیا ہے تو بعض دوسروں نے تدبر فی القرآن کو فہم رسول پر اپنے فہموں کو مقدم کرنے کا مترادف بنا دیا ہے۔ پس لوگوں کے غلط استعمال سے ان ہزاروں فوائد پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا جو اس کے علم کے ذریعہ سے حاصل کئے جا سکتے ہیں اور جو فوائد کہ اہل علم لوگوں نے ہمیشہ حاصل کئے ہیں اور جن کو وہ حاصل کر رہے ہیں۔

باوجود موضوعات کے ایک انبار کے صحیح روایات کا ایک ایسا مجموعہ موجود ہو گیا ہے جس میں ہزاروں دُرِّ بے بہا ملتے ہیں بے شک ان میں کانٹے بھی ہیں لیکن کانٹوں کی موجودگی سے گلاب کے پھول کی قدر میں کمی نہیں آجاتی۔ کون کہتا ہے کہ تم کانٹے اپنے جسم میں چبھو لو، باغبان نے گلاب کا درخت لگایا ہے اس میں کانٹے ضرور لگیں گے تم اس میں سے پھول چُنو اور ان کو استعمال کرو۔ روایتیں جمع کرنے والوں نے روایات جمع کر دی ہیں ان کی تحقیقات میں تین وجوہ سے صداقت سے دور روایات شامل ہو سکتی ہیں۔ (۱) یا تو اس وجہ سے کہ ان کی تحقیقات ناقص رہ گئی اور ایک جھوٹا سچا بن کر ان کو کوئی بات بتا گیا۔ (۲) یا اس طرح کہ انہوں نے بھی دیانتداری سے کام لیا اور دوسرے نے بھی لیکن بشریت کے اثر سے غلط فہمی کے ماتحت کوئی بات اس طرح بیان کی گئی جس طرح پہلے راوی نے بیان نہ کی تھی یا جس طرح اصل واقعہ نہ ہوا تھا۔ (۳) یا یہ کہ انہوں نے اس خیال سے ان روایتوں کو نقل کر دیا جو ان کے نزدیک بھی کمزور تھیں تا دونوں قسم کے خیالات کو پہنچا دیں تا کہ لوگوں میں تحقیق اور تدقیق کا ملکہ پیدا ہو اور تا کہ وہ لوگوں کے دلوں پر اپنے اپنے خیالات کے جبریہ عکس ڈالنے کے مرتکب نہ ہوں۔ اول الذکر سے پوری طرح بچ جانا تو انسانی طاقت سے بالکل بالا ہے اور آخر الذکر سے اگر بعض نقصانات بھی پہنچ جاتے ہیں تو اس کے بعض

عظیم الشان فوائد سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کریم میں جن منافقوں کی خبر دی جاتی ہے ان کی شرارتوں کا نقشہ ہمارے دلوں پر کب جم سکتا تھا اگر ان کی مشہور کردہ روایات کا ایک سلسلہ ہم تک نہ پہنچ جاتا۔ ان کی روایتوں کا بقیہ بھی ہمیں الفاظ قرآنیہ کی حقیقت اور اس رحم اور صبر کا پتہ دیتا ہے جس سے خدا اور رسول نے منافقوں کے متعلق کام لیا۔

غرض بعض روایات کی غلطی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کام ہی عبث تھا اور نہ محدثین کی خدمت اسلام میں کوئی شبہ لاحق ہوتا ہے اور نہ ان کی شان میں کوئی کمی آتی ہے انہوں نے فوق العادت محنت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے نقشہ کو ہمارے لئے محفوظ کر دیا ہے اور اگر ہم میں سے کوئی ان کی بشری غلطیوں سے ٹھوکر کھاتا ہے تو یہ اس کی بدقسمتی ہے اگر وہ اس قسم کی غلطیوں سے ڈر کر اس کام کو چھوڑ دیتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کے حضور میں مجرم ہوتے اور ان سے پوچھا جاتا کہ کیوں انہوں نے ایک مفید علم کو زندہ گاڑ دیا۔

مصنّف صاحب ہفوات کا یہ قول کہ چونکہ بعض ایسی احادیث مروی ہیں کہ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف ہیں اس لئے ان کو جلا دینا چاہئے اور پھاڑ دینا چاہئے اور مٹا دینا چاہئے ان کی نہایت کم علمی اور جہالت پر دلالت کرتا ہے کیا دنیا کا یہ بھی قاعدہ ہے کہ جس کتاب میں کوئی غلطی ہو جائے اسے جلا دیا جائے یا اس حصہ کو بیچ میں سے نکال دیا جائے اگر اس طریق پر عمل کیا جائے تو دنیا سے علوم کا خاتمہ ہو جائے۔ اور یہ تو سخت بددیانتی ہے کہ مصنّف کچھ لکھے اور پچھلے اس کو مٹا ڈالیں۔ اگر یہ صورت اختیار کی جائے تو کسی تصنیف پر اعتبار ہی کیا رہ سکتا ہے مثلاً پچھلی طب کی کُتب جو بو علی سینا ؒ کی تصنیف ہیں ان کو موجودہ تحقیقات کے مطابق بدل دیا جائے۔ فلسفہ میں جو جدت پیدا ہوئی ہے اس کے ماتحت پچھلی فلسفہ کی کُتب میں تبدیلی کر دی جائے گویا اپنے جاہلانہ خیالات میں تبدیلی پیدا کرنے کے سوا اور ہر ایک چیز میں تبدیلی پیدا کر دی جائے۔ مصنّف ہفوات نے اس قدر نہ سوچا کہ اگر پچھلے مصنّفین کی کُتب میں اس قسم کی تبدیلی جائز ہو تو روایت کا اعتبار کیا رہ جائے اور درایت کی بنیاد کس امر پر ہو۔ ہزاروں باتیں ہیں جو ایک زمانہ کے خیالات کی روشنی میں قبیح نظر آتی ہیں اور ایک دوسرے زمانہ کے خیالات کی روشنی میں خوبصورت۔ اگر ہر زمانہ کے لوگ اپنے خیالات کے مطابق پچھلی کتب کو بدل لیا کریں تو باقی کیا رہ جائے؟ آپ کی اس تجویز پر عمل کر کے بالکل وہی حال ہو جو اس شخص کا ہوا تھا جس کی دو بیویوں میں سے ایک بوڑھی اور ایک جوان تھی۔

بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص کی دو بیویاں تھیں ایک بڑھیا تھی اور ایک جوان۔ جب وہ عمر رسیدہ کے گھر ہوتا تو جس وقت وہ سو جاتا وہ اس خیال سے کہ یہ اپنے سیاہ بال دیکھ کر خیال کرے گا کہ یہ عورت تو بڑھیا ہو گئی ہے اور میرے بال ابھی سیاہ ہیں اس لئے میری مجالست کے قابل زیادہ جوان ہی ہے اس کے سیاہ بال ایک ایک دو دو کر چنتی رہتی۔ اسی طرح جب وہ جوان عورت کے گھر ہوتا تو وہ بھی اس خیال سے کہ یہ اگر اپنے سفید بال دیکھے گا تو خیال کرے گا کہ میں اب بوڑھا ہو گیا اب اس جوان عورت کی نسبت میری صحبت کے قابل بڑھیا عورت ہی ہے اس لئے سفید بال نوچتی رہتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد اس کے سر اور داڑھی میں نہ سفید بال رہے اور نہ کالے۔ یہی تجویز آپ کُتُبِ عِلْمِیَہ کے متعلق بتاتے ہیں کہ جس قوم کو کوئی خیال اپنے عقیدہ کے خلاف کسی کتاب میں نظر آوے جھٹ اس کا اِحکاک وہاں سے کر دے مثلاً احادیث کی تدقیق کے متعلق اختلاف ہے بعض لوگوں کے نزدیک بعض راوی کمزور ہیں بعض کے نزدیک دوسرے۔ مصنّف ہفوات کے بتائے ہوئے اصل کے مطابق ہر ایک فریق اپنے فہم کے خلاف جس قدر باتیں پائے ان کو کتب حدیث میں سے نکال دے حنفی جس قدر احادیث میں رفع یدین یا ہاتھ سینے پر باندھنے یا آمین بالجہر یا اور دیگر اختلافی مسائل کے متعلق اپنی رائے کے خلاف ذکر دیکھیں ان کو کتب حدیث سے نکال دیں۔ اور اہل حدیث ان سب حدیثوں کا اخراج کر دیں جو حنیفوں کے مسائل کی تائید میں ہیں۔ اگر ایسا ہونے لگ جائے تو آپ جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے؟ علم بالکل مفقود ہو جائے اور تحقیق کا دروازہ بند ہو جائے اور تاریخ ایسی مسخ ہو جائے کہ سَو سال پہلی بات کا معلوم کرنا بھی بالکل ناممکن ہو جائے اور بددیانتی اور خیانت کا دروازہ اتنا وسیع ہو جائے کہ اس کا بند کرنا حدِ امکان سے نکل جائے۔

ہر شخص کا اختیار ہے کہ جس بات کو ناپسند کرے ردّ کر دے لیکن کسی کو یہ اختیار نہیں کہ مصنّف کے بیان میں کمی بیشی کر دے۔ اگر کسی کو بخاری کی اکثر احادیث غلط نظر آتی ہیں تو وہ ان کو ردّ کر سکتا ہے مگر امام بخاری کی تصنیف میں سے اپنے مطلب کے خلاف باتیں نکال کر ایک نئی صورت میں اس کو بدل دینا ہرگز جائز نہیں بلکہ یہ ایک ایسی خیانت ہے، ایک ایسا فریب ہے جس کو صرف کوئی سیاہ باطن اور جاہل انسان ہی جائز قرار دے سکتا ہے۔

ایک اور خطرناک نتیجہ بھی اس جاہلانہ تجویز پر عمل کرنے سے پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ایسے زمانوں میں جب کہ کسی قوم پر فترۃ کا زمانہ آیا ہوا ہو اور جہالت اس کے میدانوں میں ڈیرے

ڈالے ہوئے ہو تمام صداقتیں باطل ہو سکتی ہیں۔ اگر مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے لوگ پچھلی چند صدیوں میں جب کہ شرک کا دور دورہ تھا تمام ایسی احادیث کتب حدیث سے نکال کر پھینک دیتے جن میں شرک کا ردّ ہے بلکہ بعض لوگوں کے اس خیال پر عمل کر کے کہ قرآن کریم میں بھی کچھ زیادتی ہو گئی ہے جس قدر آیات شرک اور رسوم اور بدعات کے خلاف دیکھتے ان کو نکال دیتے تو نتیجہ کیا ہوتا؟ اسلام کا کیا باقی رہ جاتا۔ وہ لوگ دیانتداری سے اپنے عقیدہ کے مطابق کام کرتے لیکن اس کا نتیجہ حق اور راستی کے خلاف کیسا خطرناک ہوتا۔ اس زمانہ میں تعلیم یافتہ لوگ کثرت ازدواج، طلاق اور پردہ کو اپنی عقل کے مطابق تہذیب وشائستگی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ کیا ان کا اختیار ہونا چاہئے کہ وہ قرآن وحدیث سے ایسے تمام مضامین کو یہ کہہ کر نکال ڈالیں کہ ایسی باتیں خدا اور رسول کب کہہ سکتے تھے نتیجہ یہ ہوتا کہ چند دنوں کے بعد جس کے آثار ابھی سے شروع ہو گئے ہیں جب دنیا کو معلوم ہوتا کہ یہی طریق مناسب تھا تو وہ ان اِحکاک شدہ اور اِحراق شدہ آیتوں اور حدیثوں کو قرآن کریم میں نہ پاکر اس کو ایک نامکمل اور بے معنی کتاب سمجھتے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ تمام عالم اسلام اس مرض میں مبتلا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر بیٹھے ہیں۔ اگر وہ لوگ تمام آیات قرآنیہ اور احادیث کو جو ان کی وفات پر دلالت کرتی ہیں نکال دیتے کہ ایسا خلاف واقعہ امر قرآن اور حدیث میں کہاں سے آسکتا تھا ضرور کسی مفسد نے پیچھے سے ملا دیا ہے تو کیا دنیا ایک صداقت سے اور اسلام ایک خوبی سے محروم نہ وہ جاتا؟ زمانہ کے حالات بدلتے رہتے ہیں اور لوگوں کے نقطۂ نگاہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ایک وقت میں ایک بات جو بالکل خلاف تہذیب سمجھی جاتی ہے دوسرے وقت میں عقل وعلم کی ترقی کے ساتھ وہی معقول اور مفید ثابت ہو جاتی ہے یا کبھی اس کے خلاف ایک وقت میں ایک بات اچھی سمجھی جاکر دوسرے وقت میں بُری خیال کی جانے لگتی ہے۔ اگر مصنّف ہفوات کے مجوزہ طریق اِحکاک واِحراق پر کیا عمل کیا جائے تو ہزاروں صداقتیں جہالت اور فترۃ کے زمانہ میں مٹادی جائیں۔ اور سچے مذہب کے پیرؤوں کو تحقیق وتدقیق کے زمانہ میں دوسرے مذہب کے پیرؤوں کے سامنے منہ دکھانے کی گنجائش نہ رہے۔ اس وقت جو پچھلے لوگوں کی تحقیق کی بعض غلطیاں معلوم ہوتی ہیں تو کیا اسی سبب سے نہیں کہ انہوں نے دیانتداری سے اپنے فہم کے خلاف خیالات کو باقی رہنے دیا بلکہ خود محفوظ کر دیا تاکہ تحقیق کا دروازہ بند نہ ہو جائے۔ اگر وہ لوگ بھی اس اِحکاک اور اِحراق کے طریق کو اختیار کرتے تو آج ہمارے لئے صداقت کے معلوم کرنے کا کون سا راستہ کھلا رہ جاتا؟

خلاصۂ کلام یہ کہ مصنّف ہفوات کا اِحراق واِحکاک کا مشورہ خیر خواہی و نیک طلبی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ محض ان لوگوں کے کام پر پردہ ڈالنے کے لئے ہے جنہوں نے خدمت اسلام میں رات اور دن کو ایک کر دیا۔ اگر مصنّف ہفوات یہ مشورہ نہ دیتے بلکہ سیدھی طرح یہ بات کہہ دیتے کہ باوجود ان لوگوں کی کوششوں کے بعض کوتاہیاں بھی ہو گئی ہیں تو ان کو خوف تھا کہ اس طرح لوگوں کے دل سے محدثین کی عظمت نہ مٹے گی اور وہ کہدیں گے کہ ہاں انسان سے غلطی ہو جاتی ہے اور یہ بات پہلے بھی مسلمان مانتے ہی تھے کہ محدثین غلطی سے پاک نہیں ہیں۔ بعض دفعہ انہوں نے ایک حدیث کو صحیح سمجھا ہے اور وہ بعد میں صحیح ثابت نہیں ہوئی۔ اور بعض دفعہ انہوں نے ایک حدیث کو کمزور سمجھا ہے اور وہ بعد میں کمزور ثابت نہیں ہوئی۔ پس انہوں نے ایسے الفاظ استعمال کئے جن سے دوسروں پر تو کچھ اثر ہو یا نہ ہو مگر ان کا بُغض نکل گیا اور اپنی اس عادت سب و شتم کو جو گرد و پیش کے اثرات سے متاثر ہو کر طبیعت ثانی ہو چکی ہے انہوں نے پورا کر لیا مگر کیا چاند پر تھوکنے سے چاند کا کچھ بگڑتا ہے؟ تھوکنے والے کے منہ پر تھوک آپڑتا ہے اور اسی کی فضیحت ہوئی ہے۔

میرے نزدیک مصنّف ہفوات کا یہ طریق سب و شتم زمانہ کے حالات کو مدنظر رکھ کر بھی نہایت خطرناک ہے اس وقت مختلف قسم کے مصائب اور آلام نے مسلمانوں پر یہ روشن کر دیا ہے کہ خواہ ان میں مذہبی طور پر کس قدر ہی اختلاف کیوں نہ ہو ان کو اپنی ہستی کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ ایک دوسرے پر بے جا حملہ کر کے مؤانست اور مؤاسات کے تعلقات کو قطع نہ کریں۔ اختلافِ مذاہب کو قربان نہیں کیا جا سکتا لیکن اس اختلاف کے اظہار کا طریق یہ نہیں کہ ایک دوسرے کے بزرگوں کو گالیاں دی جاویں۔ اگر ہم ایسے مذاہب کے بزرگوں کا بھی ادب کر سکتے ہیں جن کے ساتھ ہمیں نہایت کم وجہ اشتراک پائی جاتی ہے تو ایک کتاب کو ماننے والے اور ایک رسول کی امت کہلانے والے لوگوں کو جو دوسری کسی قوم میں بزرگ مانے جاتے ہوں کیوں ادب سے یاد نہیں کر سکتے۔ اس وقت تک اسلام کو کافی نقصان اس قسم کے اختلافات سے پہنچ چکا ہے اور اگر باوجود خدا تعالیٰ کے قہری نشانوں کے اب بھی دشمنی اور عداوت کے بے محل استعمال کو نہ ترک کیا گیا تو اس رویہ کے اختیار کرنے والے افراد اور ان کے افعال پر خوش ہونے والی جماعتیں ایک ایسا روزِ بد دیکھیں گی کہ دشمنوں کو بھی ان پر رونا آئے گا۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ شیعہ سنی اور دیگر ناموں سے یاد کئے جانے والے فرقے اپنے مذہب

کی تبلیغ نہ کریں۔ میرا طریق عمل میرے قول سے زیادہ اس خیال کو رد کر رہا ہے کیونکہ تبلیغی لحاظ سے اس جماعت نے کہ جس کا امیر اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل سے بنایا ہوا ہے تمام دنیا میں اپنی تبلیغی کوششوں کے ذریعہ سے حیرت انگیز حرکت پیدا کر رکھی ہے۔ بلکہ میرا یہ مطلب ہے کہ اپنے اپنے محاسن اور خوبیاں بیان کی جائیں اور دوسروں پر بِلا وجہ اور بِلا ان کی طرف سے حملہ ہونے کے حملہ نہ کیا جائے۔ اور اس حدیث کو یاد رکھا جائے قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنَ الْکَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَیْہِ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَھَلْ یَشْتِمُ الرَّجُلُ وَالِدَیْہِ قَالَ نَعَمْ یَسُبُّ اَبَا الرَّجُلِ فَیَسُبُّ اَبَاہُ وَیَسُبُّ اُمَّہٗ فَیَسُبُّ اُمَّہٗ [۲۵] فرمایا: بڑے گناہوں میں سے ایک اپنے ماں باپ کو گالیاں دینا بھی ہے۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ کیا کوئی اپنے ماں باپ کو بھی گالیاں دیتا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں کسی کے باپ کو گالیاں دیتا ہے پھر وہ اس کے باپ کو گالیاں دیتا ہے۔ یا کسی کی ماں کو گالی دیتا ہے پھر وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔ یعنی دوسرے کے ماں باپ کو گالیاں دے کر اپنے ماں باپ کو گالیاں دلوانا ایسا ہی ہے جیسا اپنے ماں باپ کو خود گالیاں دے لینا۔

جن لوگوں کو کوئی قوم اپنے روحانی ہادیوں میں سمجھتی ہے ان کی عزت اپنے ماں باپ سے زیادہ کرتی ہے ان کی نسبت بِلا وجہ گندے الفاظ استعمال کرنے کا لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اس کے بزرگوں کو گالیاں دیں اور اس صورت میں اکسانے والا ہی اپنے بزرگوں کو گالیاں دینے والا سمجھا جائے گا۔ خصوصاً جب صورت ایسی ہو کہ ایک قوم کے بزرگ دوسری قوم کے نزدیک بھی بزرگ ہوں تب تو اس دوسری قوم کے بزرگوں کو گالیاں دینا نہ صرف بُرا ہے بلکہ حد درجہ کی کمینگی کا مظہر ہے کیونکہ ایسا شخص اس امر سے کہ دوسری قوم کے لوگ اس کے بزرگوں کو بھی اپنا بزرگ خیال کرتے ہیں اور اس کی سختی کا سختی سے جواب نہیں دے سکتے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور بارہا دیکھا گیا ہے کہ ان لوگوں کو جو اس کے بزرگوں کو اپنا بزرگ خیال کرتے تھے وہ اپنی ناشائستہ حرکت سے ایسا مجبور کر دیتا ہے کہ ان میں سے بعض بطور بدلے کے ان بزرگوں کو برا بھلا کہنے لگ جاتے ہیں اور یہ شخص ایک دوست کو دشمن بنانے کا عذاب مزید براں اپنے اوپر نازل کر لیتا ہے۔

غرض سب و شتم ایک قبیح فعل ہے اور دوسروں کے بزرگوں کو گالیاں دینے والا سخت مجرم ہے اور اگر اس کی زیادتی کے سبب سے دوسری قوم کے لوگ بھی اپنی زبان کھولیں تو اس کا الزام ان پر نہیں بلکہ اس گالیاں دینے والے کے ذمہ ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ اہل شیعہ کے شرفاء اور رؤساء مصنّف کی بد کلامیوں اور بِلا وجہ کی چھیڑ چھاڑ کو اسی طرح بُرا سمجھیں گے جس طرح کہ

دوسرے فریق کو اس کا فعل بڑا معلوم ہوا ہے اور ہونا چاہئے۔

مصنف ہفوات کو جو بغض ائمہ اسلام سے ہے وہ مندرجہ ذیل عبارت سے بخوبی ظاہر ہے وہ لکھتے ہیں۔

"یہ امر ممکن تھا کہ ہم کتب عقائد واصول حدیث ورجال سے بھی ایسی احادیث کو مجروح و مقدوح کر دیتے لیکن جب یہ مسلمات عقلی ہے کہ راوی کی ثقاہت متن حدیث کی صحت کو مستلزم نہیں اور نہ خلاف قرآن حدیث حُجت ہے اور نہ وہ ہفوات درایت کی معیار پر کھری ہیں اس لئے اس بیکار طُول کو ترک کر دیا"۔

یعنی گو خود ان اصول کے مطابق جو اہل اسلام نے مقرر کئے ہیں اور خود ان قواعد کے مطابق ائمہ حدیث نے تجویز کئے ہیں ایسی احادیث کی کمزوری ثابت ہو سکتی تھی مگر یہ ایک بیکار طول تھا اس لئے مصنف ہفوات نے اس کو ترک کر دیا مگر ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک بیکار طول تھا بلکہ اگر یہ ثابت ہو جاتا کہ خود ائمہ حدیث نے ایسے قواعد تجویز کئے ہیں جن سے صحیح اور کمزور حدیثوں میں فرق کیا جائے تو لوگ سمجھ جاتے کہ حدیثوں کو کلام الٰہی کی طرح مسلمان غلطی سے پاک نہیں مانتے۔ اور اگر خود انہی ائمہ کے بنائے ہوئے قواعد کے مطابق بعض احادیث ضعیف ثابت ہو جائیں تو ان کے ذریعہ سے ائمہ حدیث کو گالیاں دینے کا موقع نہیں مل سکتا تھا پس بیکار طول سے بچنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی سب وشتم کی عادت کو پورا کرنے کے لئے مصنف ہفوات نے اس طریق کو اختیار کیا ہے اور یہ بات ان کے دلی تعصب پر ایک شاہد ناطق ہے۔

اس تمہیدی نوٹ کے بعد میں ایک ایک کر کے مصنف صاحب ہفوات کے اعتراضات کے متعلق اپنی تحقیق بیان کرتا ہوں لیکن ایک دفعہ پھر کھول کر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ کتب احادیث کے مؤلفوں کو نہ خود دعویٰ ہے کہ وہ غلطی سے پاک ہیں اور نہ کبھی مسلمانوں کو یہ دعویٰ ہوا ہے کہ ان میں کسی قسم کی غلطی نہیں ہوئی بلکہ ان کی نسبت یہی خیال علماء میں رائج چلا آیا ہے کہ وہ بعض خدام اسلام کی دیانتدارانہ اور ان تھک کوششوں کا خوبصورت اور دل آویز نتیجہ ہیں جس میں گو بعض کمیاں رہ گئی ہوں لیکن ان کے ذریعہ سے جو فائدہ دنیا کو پہنچا ہے یا پہنچتا ہے یا پہنچ سکتا ہے اس کی قیمت کا اندازہ لگانا ہمارے لئے مشکل ہے اور اللہ تعالیٰ ہی ان لوگوں کی نیک خدمات کا بدلہ ان کو دے گا۔

پہلا اعتراض

حدیث قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حُبِّبَ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَا اَلنِّسَآءُ وَالطِّیْبُ [۵] نقل کر کے آپ نے اعتراض کیا ہے۔

"مسلمانوں کو کسی کنہیا پرست نے یہ عبارت دی اور انہوں نے اس زٹل کو حدیث سمجھ لیا۔ دیکھئے رسول کی شان یہ ہے کہ معرفت الٰہی اور ہدایت خلق اور اجرائے احکام خدا میں زیادہ خوش ہو نہ کہ عورتوں اور اس کے لوازم خوشبو سے"۔ ہفوات صفحہ ۴

حیرت پر حیرت اور تعجب پر تعجب ہوتا ہے کہ کیسی اعلیٰ اور اکمل تعلیم روحانی دینے والی حدیث اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی شان کو ظاہر کرنے والی روایت کو مصنّف ہفوات نے اِحکاک اور اِحراق کے لئے چنا ہے اور اس پر ایک بہت گندہ اعتراض کیا ہے۔ اگر اس قسم کے فہم اور اس قسم کی سمجھ پر کتب روایات کا اِحکاک اور اِحراق شروع ہوا تو یقیناً صحیح احادیث کا ملنا مشکل ہو جائے گا۔

اس سوال کا جواب کہ کیا اس حدیث کے وہی معنے ہیں جو مصنّف ہفوات نے سمجھے ہیں نفی میں ہے۔ ہر شخص کی نظر اس کے اپنے تقویٰ اور معرفت کی حد تک ہی جاتی ہے اور مصنّف ہفوات اس قسم کی بات لکھنے پر مجبور ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ اس حدیث کے ہرگز وہ معنی نہیں جو مصنّف ہفوات نے سمجھے ہیں۔ مصنّف ہفوات کا یہ خیال ہے کہ اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی صحبت ہی میں وقت گزار دیتے تھے اور معرفتِ الٰہی اور ہدایتِ خلق اور اِجرائے اَحکام میں آپ کو خوشی حاصل نہ ہوتی تھی۔ اس سے زیادہ بعید معنے اس حدیث کے اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ نہ تو الفاظ حدیث میں یہ ذکر ہے کہ آپ عورتوں کی صحبت میں وقت گزارتے تھے اور نہ اس میں یہ کہیں ذکر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دین و دنیا کی چیزوں میں سب سے زیادہ عورتوں سے اور خوشبو سے محبت کرتے تھے۔ پس اس حدیث سے یہ مطلب نکالنا کہ آپ کو خدا تعالیٰ اور اس کے دین کی باتوں میں خوشی حاصل نہ ہوتی تھی یا عورتوں کی نسبت سے کم خوش ہوتے تھے۔ کسی صورت میں جائز نہیں۔ اور محض ہفوات میں داخل ہے۔ یہ معنے ایسے ہی ہیں جیسے کوئی شخص کسی دوست سے کہے کہ مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ اور آگے سے کوئی عقل کا کورا یہ سمجھ لے کہ یہ شخص اپنے والدین کا نافرمان ہے ان سے اس کو محبت نہیں ہے یا اس شخص کی نسبت ان سے کم محبت ہے۔ جب کہ ایک لفظ بھی حدیث میں ایسا نہیں ہے جس کے یہ معنی ہوں کہ عورتوں اور خوشبو کی محبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو باقی سب

چیزوں سے زیادہ تھی۔ تو مصنّف ہفوات کے کئے ہوئے معنی الفاظ حدیث سے کیونکر پیدا ہوئے۔
ہم تو دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں کل کالفظ بھی استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد بعض ہوتا ہے۔
جیسے ملکہ سبا کی نسبت آیا۔ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ [۱۶] اس کو ہر ایک چیز دی گئی تھی۔ حالانکہ
ایک چھوٹا سا ملک اس کو ملا تھا۔ نہ دنیا کی سب قسم کی نعمتیں اس کو حاصل تھیں اور نہ دین ہی اس
کو حاصل تھا پس جب کہ کُلّ کالفظ استعمال کر کے بھی بعض کے معنے ہوتے ہیں تو جہاں بالکل ہی
کوئی لفظ حصر کے لئے استعمال نہیں ہوا وہاں یہ معنی کرنا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب
ماسوا پر عورتیں اور خوشبو محبوب تھے۔ کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟

دوسرا پہلو مصنّف ہفوات کے اعتراض پر غور کرنے کا یہ ہے کہ کیا عورتوں سے محبت رکھنا
اور خوشبو کو پسند کرنا گناہ ہے یا روحانی ترقی کے حصول کے منافی ہے۔ اور اہل اللہ کے طریق سے
نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی شئے کی محبت تین طرح کی ہوتی ہے یا تو ایسی محبت کہ دوسری
اشیاء کو بالکل بھلا دے۔ یا ایسی محبت جو دوسری اشیاء کی محبت کے ساتھ دل میں رہے۔ اور کسی اور
محبت کے طفیل سے پیدا ہو۔ یا ایسی محبت جو محب کو مغلوب تو نہ کر دے لیکن مستقل محبت ہو جسے
دوسرے الفاظ میں طبعی محبت کہنا چاہئے۔ جو محبت کہ دوسرے تعلقات بھلا دیتی ہے اور ان کو نظر
میں ادنیٰ اور حقیر کر کے دکھاتی ہے وہ تو ماسوی اللہ سے ناجائز ہے اور گناہ ہے لیکن ایسی محبت جو تابع
ہو اللہ تعالیٰ کی محبت کے اور اس کی محبت کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہو وہ عین ثواب اور موجب زیادتی
ایمان اور ترقی درجات ہوتی ہے اور وہ محبت جو نہ تو اللہ تعالیٰ کی وحی اور حکم کے ماتحت پیدا ہو اور نہ
ماسوا پر غالب ہو بلکہ حدود کے اندر رہے یہ محبت طبعی محبت کہلاتی ہے اور جائز و حلال ہے۔ گو
موجب ثواب اور باعث ترقی درجات نہیں۔ ہاں یہی محبت نیک اور باخدا انسان کے اندر ترقی کرتے
کرتے دوسری قسم کی محبت بن جاتی ہے۔ پس محبت تو نہ نیکی کے منافی ہے نہ نبوت و رسالت کی
شان کے خلاف۔ بلکہ بعض وقت تقویٰ کے خلاف ہوتی ہے اور بعض وقت نہ خلاف نہ مطابق اور
بعض وقت عین تقویٰ میں داخل ہوتی ہے۔

ان تین قسم کی محبتوں کا ثبوت قرآن کریم سے ملتا ہے۔ چنانچہ سورۃ بقرۃ میں اللہ تعالیٰ فرماتا
ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا
اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ [۱۷] ترجمہ: اور لوگوں میں سے ایک جماعت ایسی ہے جو اللہ کے شریک بناتے ہیں
اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ سے محبت کرنی چاہئے اور مؤمن سب سے

زیادہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ اس جگہ دو محبتوں کا ذکر ہے۔ ایک جس میں ماسوا کی محبت وہ رنگ اختیار کر لیتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں ہونا چاہئے۔ اس کو ناپسند اور ناجائز فرمایا ہے۔ اور ایک محبت وہ بیان فرمائی ہے کہ گو دوسروں کی محبت بھی دل میں ہوتی تو ہے مگر اللہ تعالیٰ کی محبت سے کم ہوتی ہے اور اس سے ادنیٰ درجہ پر ہوتی ہے۔ اس طرح سورۃ توبہ میں فرماتا ہے قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ [۱۸]

ترجمہ: کہہ دے کہ اگر تمہارے باپ دادے اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور تجارت جس کے ماند پڑ جانے کا تمہیں ڈر ہے اور گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کے رستے میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ صادر ہو اور اللہ فاسقوں کو کبھی کامیاب نہیں کرتا۔ اس آیت سے بھی ظاہر ہے محبت دو قسم کی ہوتی ایک وہ جو حرام ہے جو خدا اور رسول کی محبت اور خدمت دین کی خواہش پر غالب آجاوے اور اس میں سستی پیدا کر دے۔ اور ایک جو جائز ہے یعنی جو اللہ تعالیٰ اور رسول کی محبت سے ادنیٰ درجہ پر ہو اور خدمت دینی کے رستہ میں روک نہ ہو۔

تیسری قسم کی محبت جو اہل اللہ اور انبیاء اور رسل کی محبت ہے اس کا ذکر قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں ہے:۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ [۱۹] ترجمہ: نیکی تمہارے مشرق و مغرب کی طرف منہ پھیرنے کا نام نہیں ہے لیکن سچی نیکی اس شخص کی نیکی ہے جو اللہ اور یوم آخر پر اور فرشتوں اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان لاتا ہے اور اللہ کی محبت کی وجہ سے اپنے قریبیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر اور لوگوں کے چھڑانے پر خرچ کرتا ہے جو مالی یا جسمانی قید میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کی محبت اپنے عزیزوں اور قریبیوں سے بھی اللہ کی محبت کے باعث ہوتی ہے اور اس کے سب رشتہ دار طبعی محبت کے علاوہ للّٰہی محبت کی رسّی سے بندھے ہوتے ہیں۔

دوسری آیت جس میں اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے یہ ہے۔ اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ۔ فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ۔ رُدُّوْهَا عَلَيَّ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ترجمہ۔ جب کہ اس کے (حضرت سلیمان علیہ السلام کے) سامنے سے نہایت اعلیٰ تین سُموں پر کھڑے ہونے والے تیز دوڑنے والے گھوڑے گزارے گئے تو انہوں نے بار بار کہا کہ میں ان دنیاوی سامانوں سے اپنے رب کی یاد کے سبب سے محبت کرتا ہوں (ذاتی محبت نہیں ہے) یہاں تک کہ جب وہ گھوڑے نظر سے دور ہو گئے تو حکم دیا کہ ان کو میرے پاس واپس لاؤ اور ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے (جیسا کہ پیار سے جانوروں پر ہاتھ پھیرا جاتا ہے)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں سے محبت رکھتے تھے اور اس کی وجہ ان کی طبعی یا جسمانی لذتیں نہ تھیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے ذکر کے قیام کے لئے وہ ایسا کرتے تھے۔ کیونکہ گھوڑوں کے ذریعہ ان کو جہاد فی سبیل اللہ میں مدد ملتی تھی۔ پس ذکر محبوب کے قیام میں ممد ہونے کے سبب سے وہ آپ کو پیارے تھے۔

مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک محبت ایسی بھی ہوتی ہے کہ وہ کسی دوسری محبت کے طفیل میں ہوتی ہے اور ایسی محبت اصل محبت کے راستہ میں روک نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی گہرائی اور عظمت پر دلالت کرتی ہے۔

اس قسم کی محبت کا ذکر قرآن کریم میں صحابہ کے متعلق آیا ہے سورۃ حشر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ترجمہ: اور وہ لوگ جو مہاجرین کی آمد سے پہلے مدینہ دارالہجرت میں رہتے تھے اور جنہوں نے ایمان کو اختیار کیا ہوا تھا وہ محبت کرتے ہیں ان سے جو ان کی طرف ہجرت کر کے آئے ہیں اور اس مال کی رغبت نہیں کرتے جو ان کو دیا جاتا ہے اور مہاجرین کو اپنی جانوں پر مقدم کر لیتے ہیں گو خود ان کو بھوک کی تکلیف ہی کیوں نہ ہو اور جو لوگ بخل نفس سے بچائے جاتے ہیں وہ کامیاب ہونے والے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ آپس میں ایک دوسرے سے اللہ کے لئے محبت کرتے تھے اور ان کا یہ فعل اللہ تعالیٰ کو محبوب تھا اور وہ اس کی تعریف فرماتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم سے تین قسم کی محبتوں کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک وہ محبت جو بُری ہوتی ہے۔ دوسری وہ جو طبعی ہوتی ہے۔ نہ اچھی نہ بُری۔ تیسری وہ جو موجب ثواب ہوتی ہے اور اس کا کرنے والا اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوتا ہے کیونکہ وہ طفیلی محبت ہوتی ہے اور خدا کی محبت کا نتیجہ ہوتی ہے پس وہ غیر کی محبت نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہی محبت ہوتی ہے اور اسی کے حکم اور اسی کی رضا کے ماتحت ہوتی ہے۔ اس تیسری قسم کی محبت کا کسی اعلیٰ سے اعلیٰ انسان میں بھی پایا جانا اس کی شان کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس کا نہ پایا جانا اس کی شان کے خلاف ہے کیونکہ اس کی محبت کی کمی کے یہ معنی ہوں گے کہ اس کی محبت اللہ تعالیٰ سے ایسی بڑھی ہوئی نہیں کہ وہ اس کی خاطر دوسروں سے بھی محبت کر سکے۔ یہ محبت جس قدر بھی کوئی اعلیٰ مرتبہ کا انسان ہو اسی قدر اس میں زیادہ پائی جائے گی۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اگر یہ بیان کیا جائے کہ آپ اپنی عورتوں سے محبت کرتے تھے تو یہ ہرگز آپ کی شان کے گھٹانے والی بات نہیں ہے آپ کا یہ فعل اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی منشاء کے بالکل مطابق تھا جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ [۴۲] ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی قسم کے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم اُن کی طرف مائل ہو کر تسلی پکڑو اور پھر تمہارے درمیان محبت اور رحمت کا سلسلہ بنایا ہے اس میں ان لوگوں کے لئے نشان ہیں جو اپنے نفوس میں غور کرنے کے عادی ہیں۔ مصنف ہفوات اگر اپنے نفس میں غور کرنے کے عادی ہوتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ عورت و مرد کا تعلق صرف شہوات کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے بہت سی حکمتیں رکھی ہیں۔ مگر ہر شخص اپنے اوپر دوسروں کی حالت کا بھی قیاس کر لیتا ہے۔

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ازواج مطہرہ کو ایک عظیم الشان نعمت قرار دیا ہے اور جنت میں مؤمن مرد کے پاس اس کی مؤمن بیوی کو رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے اور مسلمانوں کو دعا سکھائی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے قرۃ عین بننے کی دعا کرتے ہیں۔

پس اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے منشاء کے مطابق پاک بیویوں کو ایک نعمت سمجھنا اور ان کی قدر کرنا اور ان سے محبت کرنا ایک اعلیٰ درجہ کی نیکی ہے اور نیکی کا وجود نیکوں کی شان کو بڑھاتا ہے نہ کہ گھٹاتا ہے

تیسرا پہلو مصنّف ہفوات کے سوال پر غور کرنے کا یہ ہے کہ اس حدیث کے اصل معنوں پر غور کیا جائے کیونکہ بہت دفعہ انسان ایک بات کے معنے غلط کر کے اعتراض کر دیتا ہے لیکن صحیح معنے معلوم ہوں تو اعتراض دور ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک اسی حدیث کے صحیح معنے معلوم نہ ہونے کے سبب سے ہی مصنّف ہفوات کو اعتراض پیدا ہوا ہے بلکہ مصنّف ہفوات سے ایک خطرناک غلطی یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے یہ کوشش کی ہے کہ صحیح معنے معلوم نہ ہو سکیں اور حدیث کا ایک ٹکڑا اس غرض سے محذوف کر دیا ہے۔ گو اصل معنی اس حدیث کے جب میں بیان کروں گا تب معلوم ہوں گے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حدیث کو پورا نقل کر دینے سے ہر شخص سمجھ لے گا کہ مصنّف ہفوات نے دیانتداری سے کام نہیں لیا کیونکہ انہوں نے حدیث کا وہ حصہ جو اس اعتراض کو جو انہوں نے کیا ہے بالکل دور کر دیتا ہے۔ چھوڑ دیا ہے۔

حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں حَدَّثَنَا سَلَامٌ اَبُو الْمُنْذِرِ عَنْ ثَابِتٍ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حُبِّبَ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَا اَلنِّسَاءُ وَالطِّیْبُ وَجُعِلَ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ ایک دوسری روایت میں ہے مِنْ دُنْیَاکُمْ[۲۳] ترجمہ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے پسند کرائی گئی ہیں تمہاری دنیا میں سے عورتیں اور خوشبو اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک تو نماز ہی میں رکھی گئی ہے۔ اس آخری فقرہ کی موجودگی میں کیا مصنّف ہفوات کا اعتراض پڑ سکتا تھا کہ۔ "رسول کی یہ شان ہے کہ وہ معرفتِ الٰہی اور ہدایتِ خلق اور اِجرائے اَحکامِ خدا میں زیادہ خوش ہو نہ کہ عورتوں اور اس کے لوازم خوشبو سے معاذ اللہ" صفحہ ۴۔ پس ان کا اس فقرہ کو چھوڑ دینا بتاتا ہے کہ ان کی نیت اعتراض پیدا کرنا تھی نہ کہ اِحقاقِ حق۔

پیشتر اس کے کہ میں اصل معنی اس حدیث کے بیان کروں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ حب کے معنے عشق کے نہیں ہوتے جیسا کہ مصنّف ہفوات نے سمجھے ہیں۔ بلکہ یہ ایک وسیع معنوں کا لفظ ہے اور لغت میں اس کے یہ معنی لکھے ہیں۔ اَلْحُبُّ نَقِیْضُ الْبُغْضِ وَالْحُبُّ اَلْوِدَادُ وَالْمَحَبَّۃُ[۲۴] یعنی حُبّ کا لفظ بُغض کے خلاف معنیٰ رکھتا ہے اور اس کے معنے وداد اور محبت کے ہوتے ہیں ان معنوں کو مدنظر رکھ کر حب کے معنے کسی کو پسند کرنے اس کو چاہنے اس کی خیر خواہی کرنے کے ہوتے ہیں۔ یعنی عشق کے معنے نہیں بلکہ عام خیر خواہی اور پسندیدگی سے لیکر اعلیٰ سے اعلیٰ کشش اور اتّصال کے معنی اس لفظ کے ہیں۔ چنانچہ ان معنوں میں یہ لفظ قرآن کریم اور احادیث اور لغت عرب میں کثرت سے مستعمل ہے۔ قرآن کریم میں خیر خواہی کے معنوں میں سورۃ قصص

میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ [۲۵] ترجمہ: تو ہر اس شخص کو ہدایت نہیں دے سکتا جس کی ہدایت کا تو خواہاں ہے لیکن اللہ جسے پسند کرتا ہے ہدایت دیتا ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ کون لوگ ہدایت کے مستحق ہیں۔ اس حدیث سے ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفار سے بھی محبت رکھتے تھے پس اگر مصنّف ہفوات کے معنوں کے مطابق یوں سمجھا جائے کہ محبت کے معنے عشق کے اور ماسوا کو بھلا دینے کے ہوتے ہیں تو اس آیت کے نَعُوْذُ بِاللّٰہِ یہ معنے بن جائیں گے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی محبت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ آپ معرفت الٰہی اور اجرائے احکام خدا میں زیادہ خوش نہ ہوتے تھے مگر ایسا خیال کفر ہے آپ کا وجود تو اس آیت کا مصداق تھا۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ [۲۶] پس اس آیت میں محبت کے معنی خیر خواہی کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ تُو تو سب دنیا کا ہی خیر خواہ ہے اور چاہتا ہے کہ سب کو ہدایت مل جائے مگر تیری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ انہی لوگوں کے لئے ہدایت کے سامان جمع کرتا ہے جو خود ہدایت کے جویاں ہوتے ہیں اور ہدایت کا مقابلہ نہیں کرتے۔

کسی چیز کو نسبتی طور پر پسند کرنے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے گو وہ اپنی ذات میں اچھی نہ ہو۔ چنانچہ حضرت یوسف کی نسبت آتا ہے قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْہِ [۲۷] ترجمہ۔ یوسف علیہ السلام نے کہا۔ اے میرے رب! قید خانہ مجھے اس سے جس کی طرف یہ عورتیں مجھے بلاتی ہیں زیادہ پسند ہے۔ اس جگہ محبت کا لفظ ایک ایسی بات کی نسبت استعمال ہوا ہے جو اپنی ذات میں بری ہے لیکن نسبتی ترجیح کے سبب سے اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔

طبعی محبت اور عشق کے متعلق میں یہ پہلے آیات لکھ آیا ہوں اس لئے اس جگہ اس کی تکرار کی ضرورت نہیں۔

احادیث میں بھی یہ لفظ کثرت سے ان معنوں میں استعمال ہوا ہے چنانچہ حُبّ کے معنوں کی تشریح میں لسان العرب نے دو حدیثیں لکھی ہیں جن سے حب کے معنوں کی خوب تشریح ہو جاتی ہے ایک حدیث تو یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احد پہاڑ کی نسبت فرمایا ھٰذَا جَبَلٌ یُّحِبُّنَا وَنُحِبُّہٗ [۲۸] وہ ایک ایسا پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے

ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ محبت کا لفظ نفع رسانی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے پہاڑ محبت نہیں کیا کرتے۔ پہاڑ کی محبت سے اس کا وہ نفع ہے جو وہ پہنچاتا ہے چونکہ احد کی جنگ میں ایک غلطی کے سبب سے مسلمانوں کو تکلیف اٹھانی پڑی اور لشکر اسلامی کا اجتماع احد پہاڑ پر ہی ہوا اور وہ دشمن کے حملوں سے بچانے کا ایک ذریعہ ہو گیا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ ہمیں نفع پہنچاتا ہے اور ہم اس کے قیام کو پسند کرتے ہیں۔

اسی طرح لسان نے ایک دوسری حدیث انسؓ سے لکھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اُنْظُرُوْا حُبَّ الْاَنْصَارِ التَّمْرَ [۲۹] انصار کی محبت کھجور سے دیکھو۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ انصار کھجور کے عشق میں سرشار تھے۔ بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ انصار کھجور کے مفید ہونے کو دیکھ کر اس کی حفاظت کرتے تھے اور اس کے بونے اور جمع کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔

اسی طرح حدیث میں آتا ہے اِذَا ابْتَلَیْتُ عَبْدِیْ بِحَبِیْبَتَیْهِ فَصَبَرَ [۳۰] یعنی جب بندے کی آنکھیں ضائع ہو جائیں اور وہ صبر کرے۔ آنکھوں کے لوگ عاشق نہیں ہوتے بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کے فائدہ کو دیکھ کر ان کی قدر کرتے ہیں اور ان کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کو ضائع ہونے سے بچاتے ہیں۔

غرض محبت کے معنے وسیع ہیں کسی چیز کو نفع رساں سمجھ کر اس کی قدر کرنی اور اس کو تباہ ہونے سے بچانے کی کوشش کرنے اور نفع پہنچانے کے علاوہ طبعی کشش اور اتصال اور پھر کلی طور پر کسی کے خیال میں محو ہو جانے تک اس لفظ کا دائرہ وسیع ہے۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ محبت کے معنے صرف عشق کے نہیں ہیں جیسا کہ مصنف ہفوات نے اپنی ناواقفیت سے سمجھا ہے تو اب اس حدیث کے معنی سمجھنے میں کوئی دقت نہیں رہی۔ اس حدیث میں اَلنِّسَآءُ کا لفظ ہے اور اَلنِّسَآءُ کے معنی عورتیں اور بیویاں دونوں ہو سکتے ہیں اور میرے نزدیک اس جگہ عورتوں کے معنے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ بیان فرماتے ہیں کہ مجھے دنیا کی باتوں میں سے خصوصیت کے ساتھ عورتوں کی خیر خواہی اور خوشبو کی اشاعت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ مگر باوجود اس کے مجھے اصل لذت عبادت الٰہی میں دی گئی ہے یعنی مخلوق کی اصلاح کی طرف بھی توجہ کرتا ہوں مگر جو لطف اللہ تعالیٰ کی طرف جھکنے میں آتا ہے اتنا لطف اس کام میں نہیں آتا کیونکہ یہ کام درحقیقت ضمنی ہے اصل کام اللہ تعالیٰ سے ملنا ہے ہاں خدا نے چونکہ اس کام کو بھی ضروری قرار دیا ہے اس لئے اس طرف بھی توجہ کرنی پڑتی

ہے۔

اس حدیث کو مدنظر رکھو اور اس حالت کو دیکھو جو اسلام سے پہلے عورتوں اور طہارت کی تھی اور معلوم کرو کہ کیا یہ حدیث ایک اعلیٰ درجہ کی صداقت اور خوبی پر مشتمل ہے یا نہیں؟ کیا اس میں کچھ شک ہے کہ اسلام سے پہلے عورتوں کے حقوق کو پامال کیا جاتا تھا اور ان کے لئے ابدی حیات کا انکار کیا جاتا تھا اور ان کو مالوں اور جائدادوں کی طرح ایک منتقل ہونے والا ورثہ خیال کیا جاتا تھا اور ان کی پیدائش کو صرف مرد کی خوشی کا موجب قرار دیا جاتا تھا حتیٰ کہ مسیحی جو اپنے آپ کو حقوق نسواں کے حامی کہتے ہیں ان کے پاک نوشتوں میں بھی عورت کی نسبت لکھا تھا۔ "البتہ مرد کو اپنا سر ڈھانکنا نہ چاہئے کیونکہ وہ خدا کی صورت اور اس کا جلال ہے" اسی طرح لکھا تھا۔ "اور میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت سکھائے"۔[۳۱] اسلام ہی ہے جس نے عورتوں کی انسانیت کو نمایاں کر کے دکھایا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عورتوں کے بلحاظ انسانیت برابر کے حقوق قائم کئے اور وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ[۳۲] کی تفسیر لوگوں کے خوب اچھی طرح ذہن نشین کی۔ آپ کے کلام میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق اور ان کی قابلیتوں کے متعلق جس قدر ارشادات ہیں ان کا دسواں حصہ بھی کسی مذہبی پیشوا کی تعلیم میں نہیں ملتا اور یہی مطلب ہے حُبِّبَ اِلَیَّ النِّسَآءُ کا یعنی عورتوں کی قدردانی اور ان کی خوبیوں کا احساس میرے دل میں پیدا کیا گیا ہے۔

وہی سلوک جو عورتوں سے آنحضرت کی بعثت سے پہلے کیا گیا تھا کم و بیش طور پر خوشبو سے بھی کیا گیا تھا۔ عیسائیوں میں اور ہندوؤں کے بعض فرقوں میں بزرگان دین کے لئے پاک رہنا اور خوشبو کا استعمال بالکل حرام سمجھا جاتا تھا گندے اور بدبودار لباس کا استعمال اور ناخن نہ کٹوانا میل نہ اتارنا بہت بزرگی خیال کی جاتی تھی اور مختلف اقوام میں بھی خوشبو کے استعمال کو روحانیت کے لئے مُضِر سمجھا جاتا تھا حالانکہ جیسا کہ طب سے ثابت ہوا ہے خوشبو صحت کی بہتری اور خیالات کے بلند کرنے میں مُمِد ہوتی ہے اور بدبُو اس شخص کے لئے بھی مُضِر ہوتی ہے جو گندہ رہتا ہے اور دوسروں کو بھی اس سے ضرر ہوتا ہے جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَنْ اَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ يَعْنِيْ اَلثُّوْمَ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا فَاِنَّ الْمَلٰٓئِكَةَ تَاَذّٰى مِمَّا يَتَاَذّٰى مِنْهُ الْاِنْسُ[۳۳] یعنی جو شخص اس بُودار پودے لہسن کا استعمال کرے اسے چاہئے کہ مسجدوں میں نہ آئے کیونکہ ملائکہ بھی ان چیزوں سے تکلیف محسوس کرتے ہیں جس سے انسان تکلیف محسوس

کرتے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بُو کو لوگوں کے لئے مُضِر قرار دیا ہے اور یہی وجہ تھی کہ آپ نے جمعہ کے دن بوجہ اجتماع کے خوشبو کے استعمال کا حکم دیا۔

غرض کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ایک یہ بات تھی کہ آپ نے جگہ کی پاکیزگی کے علاوہ جو مختلف مذاہب میں ضروری سمجھی جاتی تھی شخصی صفائی کو بھی ضروری قرار دیا اور اسی مضمون کی طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

لیکن چونکہ بعض لوگ افراط کا پہلو اختیار کر لیتے ہیں اس لئے فرما دیا وَ جُعِلَتْ قُرَّةُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ یعنی میری اصل راحت نماز میں ہی رکھی گئی ہے۔ پس چاہئے کہ میرے ان احکام کو دیکھ کر عورتوں سے نیک سلوک ہونا چاہئے اور خوشبو کا استعمال کرنا چاہئے کوئی شخص یہ غلط مفہوم نہ لے لے کہ بس عورتوں کی رضا میں لگا رہے اور ظاہری صفائی میں ہی لگا رہے بلکہ چاہئے کہ عورتوں سے حسن سلوک بھی کرو اور ظاہری پاکیزگی کا بھی خیال رکھو لیکن اصل لذت تم کو اللہ تعالیٰ ہی کی یاد میں حاصل ہو۔

مصنّف صاحب ہفوات ان معنوں پر غور کریں اور سوچیں کہ کیا یہ حدیث احکاک اور احراق کے قابل ہے یا اس قابل ہے کہ اس کو دشمنوں کے سامنے اسلام کی خوبیوں کے اظہار اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کے لئے پیش کیا جائے ان کو چاہئے کہ جب وہ کسی حدیث کے معنی کرنے لگیں تو یہ دیکھ لیا کریں کہ وہ ان کی نسبت نہیں ہے بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ہے اور اس کے اندر ان کے خیالات کا اظہار نہیں ہے بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خیالات کا اظہار ہے اور اپنے خیالات اور جذبات کے مطابق اس کا ترجمہ نہ کیا کریں۔

اگر اس حدیث میں نساء کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس کے معنے بیویاں کیا جائے تب اس حدیث کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے بیویوں اور خوشبو کی طرف میری رغبت جبراً کی ہے ورنہ میری لذت تو نماز ہی میں ہے اور یہ معنی بھی صحیح ہیں۔ اگر اسلام میں رہبانیت کو روکا نہ جاتا اور اس کی اجازت دی جاتی تو اغلب تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم امور خانہ داری میں پڑنے کی بجائے اپنے اوقات کو ذکر الٰہی میں ہی صرف کرتے۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کو ذکر الٰہی کا جزو قرار دیا ہے اور خصوصاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تو بہت سی بیویوں کا ہونا ضروری تھا تاکہ وہ عملاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے طریق معاشرت کو سیکھیں اور دوسروں کو سکھائیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حُبِّبَ بصیغہ مجہول فرمایا ہے اُحِبُّ بصیغہ معروف

نہیں فرمایا۔ پس حدیث کے یہ معنے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی حکمت کاملہ کے ماتحت میں نے بہت سے نکاح کئے ہیں اور خوشبو کو پسند کرتا ہوں ورنہ میری لذت تو ذکر الٰہی میں تھی۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ دنیا کی کوئی لذت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بخواہش خود استعمال نہیں فرماتے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے منشاء اور اس کے ازلی قانون کی متابعت میں بقدر ضرورت دنیا کی چیزوں سے تعلق رکھتے تھے اور یہ مضمون آیت اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کے عین مطابق ہے اور اس پر اعتراض کرنا کور چشمی کی دلیل ہے۔

میں نے اس اعتراض پر زیادہ بسط سے اس لئے لکھا ہے کہ یہ ایک اصولی سوال ہے اور مصنّف ہفوات کی طرح بہت سے لوگ اس وہم میں پڑے ہوئے ہیں کہ استعمال طیّبات شائد ایک مکروہ بات ہے جو عام مومنوں کو تو جائز ہو سکتی ہے مگر بزرگوں اور نبیوں کے لئے جائز نہیں حالانکہ معاملہ برعکس ہے۔ طیّبات ایک نعمت ہے اور ہر نعمت کے اصل مستحق اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے ہیں اگر ان کا وجود نہ ہوتا تو یہ دنیا ہی پیدا نہ کی جاتی۔ ہاں چونکہ وہ اپنی محبت کو خدا ہی کے لئے وقف کر چکے ہوتے ہیں وہ جس دنیاوی کام کو کرتے ہیں محض احکام الٰہی کی بجا آوری میں کرتے ہیں اور اس کے قانون کے ادب کو مدنظر رکھ کر کرتے ہیں اور وہ لوگ جو ان نعمتوں کے حقیقی مستحق نہیں ہیں وہ زیادہ شوق انہی کا رکھتے ہیں جیسے ایک شخص کسی دوست کو ملنے جاتا ہے تو جب کہ مہمان کی تمام توجہ اپنے دوست کی صحبت سے فائدہ اٹھانے میں لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اور وہ کھانا محض دوست کے اظہار محبت کی قدر کے طور پر کھاتا ہے اس کے نوکروں کی توجہ زیادہ تر کھانے کی طرف ہوتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ ایک حق پسند انسان کی تسلی کے لئے کافی ہے لیکن سب دنیا حق پسند نہیں ہوتی اور خصوصاً مصنّف ہفوات کے تو ایک ایک لفظ سے تعصّب اور بُغض ٹپک رہا ہے ان کی نسبت یہ خیال بہت مشکل ہے کہ وہ بِلا اپنے گھر کے بھید معلوم کرنے کے خاموش ہوں بلکہ کوئی تعجب نہیں کہ وہ سب جواب پڑھ کر پھر بھی تحریر فرما دیں کہ ’’مسلمانوں کو کسی کنہیا پرست نے یہ عبارت دی اور انہوں نے اس زٹل کو حدیث سمجھ لیا‘‘ پس چاہتا ہوں کہ ان کو بتا دوں کہ وہ کنہیا پرست (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ) کا لفظ کس کی نسبت استعمال کر رہے ہیں۔ فروع کافی جلد ۲ کتاب النکاح باب حبّ النساء میں عمر بن یزید امام ابو عبداللہ سے روا کرتے ہیں قَالَ مَا اَظُنُّ رَجُلاً یَزْدَادُ فِی الْاِیْمَانِ اِلَّا ازْدَادَ حُبًّا لِلنِّسَاءِ [۳۴] ترجمہ

میں ہرگز خیال نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص ایمان میں ترقی کرتا ہو بلا اس کے کہ ساتھ ساتھ عورتوں کی محبت میں بھی بڑھتا ہو۔ دوسری روایت حفص بن البختری کی امام ابو عبداللہ سے اسی کتاب اور اسی باب میں درج ہے اور وہ یہ ہے قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ مَا اَحْبَبْتُ مِنْ دُنْیَاکُمْ اِلَّا النِّسَآءَ وَ الطِّیْبَ [۳۵] ترجمہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میں تمہاری دنیا میں سے محبت نہیں کرتا مگر عورتوں اور خوشبو سے۔ یہ الفاظ ابو داؤد کی روایت سے بہت زیادہ سخت ہیں کیونکہ اس میں تو حُبِّبَ کے لفظ تھے جن کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ میں خود تو محبت نہیں کرتا مجھ سے محبت کرائی جاتی ہے لیکن امام ابو عبداللہ ایک طرف تو یہ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص ایمان میں ترقی ہی نہیں کر سکتا جب تک اسے عورتوں سے محبت نہ ہو۔ دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں کہ آپ فرماتے ہیں میں تمہاری دنیا میں سے عورتوں اور خوشبو سے محبت کرتا ہوں اب مصنف ہفوات صاحب فرمائیں کہ کیا وہ کنھیّا پرست اور واضع حدیث کے الفاظ اس امام اہل بیت کی نسبت بھی استعمال کریں گے یا صرف یہ الفاظ ابو داؤد ہی کی نسبت استعمال کئے جا سکتے ہیں؟ ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ جب کوئی شخص کسی راستباز انسان پر اعتراض کرتا ہے تو اس کا قدم ٹھہر ہی نہیں سکتا جب تک سب راستبازوں پر حملہ نہ کرے کیونکہ راستباز سب ایک زنجیر سے بندھے ہوئے ہیں اور سب کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے جو ان میں سے کسی ایک کے راستہ میں پتھر رکھتا ہے وہ سب کو گرانے کی کوشش کرتا ہے جو ایک کو دھوکا دیتا ہے وہ سب کو دھوکا دیتا ہے یا تو انسان سب راستبازوں کو قبول کرلے یا اسے سب کو ردّ کرنا پڑے گا۔ اور اس کا دعوائے ایمان اس کے کسی کام نہ آئے گا۔ کیونکہ اس کے اقوال اس کے ایمان کو رد کر رہے ہیں۔

اس سے بھی بڑھ کر وہ روایت ہے جو علی بن موسیٰ رضاؑ سے معمر بن خلاد نے بیان کی ہے اور وہ یہ ہے یَقُوْلُ ثَلٰثٌ مِّنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِیْنَ الْعِطْرُ وَاَخْذُ الشَّعْرِ وَ کَثْرَۃُ الطَّرُوْقَۃِ☆ [۳۶] یعنی

☆ مصنف صاحب ہفوات نے دوسرے ایڈیشن میں کچھ تبدیلیاں کر دی ہیں چنانچہ عورتوں اور خوشبو کی محبت کے متعلق چونکہ ان کو اپنے بزرگوں سے معلوم ہوا ہے کہ ان کا ذکر تو سنّیوں سے بڑھ کر ہماری کتب میں موجود ہے اس لئے انہوں نے دوسرے ایڈیشن میں اعتراض کا پہلو یوں بدل دیا ہے کہ ان چیزوں سے محبت تو ہر صحیح القویٰ کو ہوتی ہے رسول کی کیا خصوصیت ہے؟ لیکن یہ اعتراض بھی ویسا ہی بودہ ہے کیونکہ حدیث میں خصوصیت کا ذکر ہی

تین چیزیں نبیوں کی سنتوں میں سے ہیں اول خوشبو، دوم بال صاف کرنا، سوم کثرت جماع۔ اب مصنف ہفوات بتائیں کہ علی بن موسیٰ الرضا تو عورتوں کی صحبت کی کثرت کو سنت انبیاء قرار دیتے ہیں۔ پھر آپ اسے کنہیا پرستی قرار دے کر کس کو گالیاں دے رہے ہیں؟ آیا ائمہ اہل سنت کو یا خود ائمہ اہل بیت کو؟

مندرجہ بالا احادیث جو اہل شیعہ کی روایات میں سے ہیں۔ مصنف ہفوات کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہوں گی۔ مگر میں دو اور روایتیں لکھ کر جو ان سب سے بڑھ کر ہیں ان کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان کو پھوس کے گھر میں بیٹھ کر آگ سے نہیں کھیلنا چاہئے۔ ایک شیعہ صاحب امام ابو عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم نے حضرت امام ابو عبداللہ سے پوچھا کہ سب سے زیادہ لذیذ شئے کیا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا اَلَذُّ الْاَشْیَاءِ مُبَاضَعَةُ النِّسَاءِ [۲۷] سب سے زیادہ لذیذ چیز عورت سے جماع کرنا ہے وہ لفظ جو امام ابو عبداللہ کی طرف اس شیعہ مخلص نے منسوب کئے ہیں بہت زیادہ ننگے اور واضح ہیں لیکن میں نے ان کا ترجمہ سنجیدہ الفاظ میں کر دیا ہے۔ امید ہے کہ مصنف صاحب ہفوات لغت دیکھ کر خود معلوم کر لیں گے کہ ان لفظوں کا لفظی ترجمہ ہماری زبان میں کیا ہو سکتا ہے۔ اور پھر اس طرز تحریر کو بدلنے کی کوشش کریں گے جو الفاظ احادیث کی وجہ سے نہیں بلکہ بخاری کے مترجم کے بعض نامناسب الفاظ سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے اپنی کتاب میں اختیار کی ہے۔

دوسری روایت اہل شیعہ کی جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں حسب ذیل ہے۔ عقبہ بن خالد بیان کرتے ہیں میں ابو عبداللہ علیہ السلام کے پاس آیا جب آپ گھر سے نکل کر آئے تو کہا کہ یَا عُقْبَةُ شَغَلَنَا عَنْکَ ھٰؤُلَآءِ النِّسَآءُ [۲۸] ترجمہ۔ اے عقبہ! ان عورتوں نے ہمیں مشغول رکھا اور تیرے پاس نہ آنے دیا۔ مذکورہ بالا دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو امام صاحب جو نبیوں کی طرح آپ کے عقیدے میں معصوم تھے عورتوں سے تعلق کو سب سے زیادہ لذیذ شئے بتاتے ہیں۔ دوسرے دین کی خدمت پر آنے والے لوگوں سے عورتیں ان کو روک بھی لیتی ہیں اور

(بقیہ فوٹ نوٹ) نہیں بلکہ اظہار واقعہ ہے مگر سوال یہ ہے کہ یہی احادیث کتب شیعہ میں بھی موجود ہیں وہ کس خصوصیت کی وجہ سے ...... ہیں؟ تعجب پر تعجب یہ ہے کہ اس قدر تبدیلی کے بعد مصنف صاحب ہفوات نے دوسرے ایڈیشن میں پھر پہلے ہی اعتراض دُہرا دیئے ہیں۔

وہ ان کی صحبت میں بیٹھے ہوئے خدمت دین کو بھول جاتے ہیں۔ کیا اب اہل سنت بھی کہہ دیں کہ۔ "امام کی شان تو یہ ہے کہ وہ معرفت الٰہی اور ہدایت خلق اللہ اور اجرائے احکام خدا میں زیادہ خوش ہو نہ کہ عورتوں اور اس کے لوازم خوشبو سے" (مَعَاذَ اللّٰہ)۔ اور کیا مصنّف صاحب ہفوات اپنے اعوان شیعہ صاحبان کی مدد سے ان کتب اہل شیعہ کے احکاک سے فارغ ہو لینا چاہئے پھر دوسری طرف توجہ کرنی چاہئے کیونکہ دوسرے کو کہنے کا وہی شخص مستحق ہوتا ہے جو پہلے اپنے گھر کا انتظام کر لے۔

یہ جواب تو اس اصل کو مدنظر رکھتے ہوئے ہے جو مصنف ہفوات نے تجویز کیا ہے لیکن ہم جس اصل کو صحیح تسلیم کرتے ہیں اسکے رو سے امام ابو عبداللہ کی طہارت اور پاکیزگی اور تقویٰ اور بزرگی میں کچھ بھی فرق نہیں آتا۔ نہ ان کتب اہل شیعہ کی تحقیر ہوتی ہے۔ ہم جب تک بددیانتی ثابت نہ ہو ان کی کوشش کی بھی قدر کرتے ہیں اور میرے نزدیک انہوں نے ائمہ اہل بیت کے اقوال نقل کر کے ایک قابل قدر خدمت کی ہے۔ اگر اس خدمت میں نادانستہ ان سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو اس سے ان کی شان میں کوئی فرق نہیں آتا۔ نہ ان کی کتابوں کی عظمت کو صدمہ پہنچتا ہے اور اگر دانستہ غلطی کی ہے تو اس کے ذمہ دار وہ خدا تعالیٰ کے حضور میں ہوں گے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ سے عشق

دوسرا اعتراض

مصنّف ہفوات کا یہ ہے کہ احادیث میں لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کے عاشق تھے۔ اور یہ بات غلط ہے۔ اور اس کی تائید میں انہوں نے کئی احادیث نقل کی ہیں جن کے متعلق میں الگ الگ لکھتا ہوں اول تو انہوں نے جواب الکافی سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ ام سلمہؓ نے کہا کَانَ اِذَارَاٰی عَائِشَۃَ لَایَتَمَالَکُ نَفْسَہٗ [۹] جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کو دیکھتے تھے تو ان کا اپنے نفس پر قابو نہیں رہتا تھا۔ یہ روایت جواب الکافی میں بلاحوالہ کتاب اور بلا سند درج ہے اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی کتاب میں سے مصنّف کتاب نے درج کی ہے یا یہ کہ ان بے شمار ناقابل اعتبار روایات میں سے ایک ہے جو عام طور پر مجالس وعظ کی زینت کے لئے لوگوں میں مشہور تھیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس حدیث کا مضمون قابل اعتراض ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف اور قرآن کریم کے بتائے ہوئے اخلاقِ محمدی کے برعکس ہے۔ پس یہ روایت بہ سبب مضمون قرآن اور صحیح روایات اور عقل

سلیم کے خلاف ہونے کے غلط ہے۔ اور ان روایات سے معلوم ہوتی ہے جو عبداللہ بن ابی بن سلول کے چیلے چانٹوں کی طرف سے مشہور کی جاتی تھیں اور جن کا ذکر بعد میں منافق مسیحی اور یہودی نَو مسلموں نے تازہ رکھا۔ مگر باوجود اسکے کہ یہ روایت میرے نزدیک بالکل ناقابل اعتبار اور صریح دروغ ہے اس کے پیش کرنے سے مصنّف ہفوات کا جو منشاء ہے وہ کسی صورت میں پورا نہیں ہو سکتا نہ اس روایت کا جھوٹا ہونا جیسا کہ میں پہلے ثابت کر آیا ہوں محدثین کی شان کو کم کر سکتا ہے۔ اور نہ ضرورت حدیث کو باطل کر سکتا ہے اور نہ اس کے جھوٹے ہونے سے ہمارے لئے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ اس روایت کو کتابوں میں سے نکال پھینکیں۔ اگر ہم ایسا کرنے لگیں تو بعض دوسرے لوگ اس کے مقابل میں صداقتوں کو بھی نکال کر پھینک دیں گے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ احادیث کی کتب غلطی سے پاک نہیں ہیں اور نہ ہر ایک کتاب نیک نیتی سے لکھی گئی ہے کئی کتب محض مجالس وعظ کو رونق دینے کے لئے لکھی گئی ہیں مگر باوجود اس کے اس فن کے کمال تک پہنچانے والوں کی خدمت اسلام کا انکار نہیں ہو سکتا اور ہزاروں حدیثوں کے جھوٹا نکلنے پر بھی اس فن کی حقارت نہیں کی جا سکتی۔ اس وقت کوئی شخص قابل ملامت ہو سکتا ہے جب کہ وہ ان مُزیلِ شانِ رسالت احادیث کو صحیح قرار دے اور ان کی ایسی تاویل بھی نہ کرے جس سے وہ اعتراض دور ہو جائے جو ان سے پیدا ہوتا ہے۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ علماء سلف ایسی روایات کو ہمیشہ باطل قرار دیتے چلے آئے ہیں پس صرف نقل کر دینے کے سبب وہ کسی الزام کے نیچے نہیں آسکتے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ہمیں ہر ایک قسم کی روایات لوگوں کے لئے جمع کر دینا چاہئے۔ ہاں علماء خلف بے شک اس الزام کے نیچے ہیں کہ انہوں نے ان احادیث اور روایات کو اتنا رواج نہیں دیا جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی شان ظاہر ہوتی تھی اور اپنے وعظوں کو عوام میں دلچسپ بنانے کے لئے جھوٹے قصوں اور غلط روایات کو صحیح احادیث قرار دے کر لوگوں میں خوب رائج کیا بلکہ ان کا انکار کرنے والوں کو اسلام کا دشمن اور حدیث کا دشمن قرار دیا۔ ایسے لوگوں کے طریق عمل کو ہم اس سے بھی زیادہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جتنا کہ مصنّف صاحب ہفوات کے طریق عمل کو دیکھتے ہیں کیونکہ مصنّف صاحب ہفوات نے تو ازدواج مطہرات اور صحابہ کرام اور علماء اسلام پر حملہ کیا ہے اور ان لوگوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے اور عبداللہ بن ابی بن سلول کے ہم آواز ہو گئے ہیں۔ ہماری جماعت کی کوششیں شروع سے ایسے ناپاک لوگوں کے

خلاف صرف ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی جب تک کہ یہ لوگ اہل اکاذیب ہوتے ہوئے حدیث کے نام کو بدنام کرنا اور قرآن کریم پر روایات کو جو محتمل کذب و صدق ہیں۔ مقدم کرنا نہ چھوڑ دیں گے۔

دوسری روایت اس خیال کی تصدیق میں مصنف ہفوات نے بخاری کتاب التفسیر سے پیش کی ہے۔ یہ روایت ابن عباس سے مروی ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابن عباس کہتے ہیں کہ میرے دل میں مدت سے خواہش تھی کہ میں حضرت عمر سے ایک بات دریافت کروں آخر ایک دن موقع پاکر میں نے آپ سے پوچھا کہ وہ دو عورتیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف آپس میں ایک دوسرے کی مدد کی تھی وہ کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا وہ حفصہ اور عائشہ ہیں اور پھر فرمایا کہ ہم لوگوں میں عورتیں بالکل حقیر سمجھی جاتی تھیں حتیٰ کہ قرآن کریم میں ان کے حقوق مقرر ہوئے۔ ایک دن کسی بات کو میں سوچ رہا تھا میری بیوی نے مجھے کہا کہ اگر اس طرح کر لو تو اچھا ہے میں ناراض ہوا کہ تیرا حق کیا ہے کہ مجھے مشورہ دے اس پر میری بیوی نے کہا عَجَبًا لَّکَ یَا ابْنَ الْخَطَّابِ مَاتُرِیْدُ اَنْ تُرَاجَعَ اَنْتَ وَاِنَّ ابْنَتَکَ لَتُرَاجِعُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی یَظَلَّ یَوْمَہٗ غَضْبَانَ فَقَامَ عُمَرُ فَاَخَذَ رِدَائَہٗ مَکَانَہٗ حَتّٰی دَخَلَ عَلٰی حَفْصَۃَ فَقَالَ لَھَا یَابُنَیَّۃُ اِنَّکِ لَتُرَاجِعِیْنَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی یَظَلَّ یَوْمَہٗ غَضْبَانَ فَقَالَتْ حَفْصَۃُ وَاللّٰہِ اِنَّا لَنُرَاجِعُہٗ فَقُلْتُ تَعْلَمِیْنَ اَنِّیْ اُحَذِّرُکِ عُقُوْبَۃَ اللّٰہِ وَغَضَبَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ یَابُنَیَّۃُ لَا یَغُرَّنَّکِ ھٰذِہِ الَّتِیْ اَعْجَبَھَا حُسْنُھَا حُبُّ رَسُوْلِ اللّٰہِ اِیَّاھَا یُرِیْدُ عَائِشَۃَ [۲] (ترجمہ) اے ابن خطاب! تجھ پر تعجب ہے کہ تو ناپسند کرتا ہے کہ تیری بیوی تیری بات میں بولے اور تیری بیٹی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کا جواب دیتی ہے یہاں تک کہ آپ کبھی سارا سارا دن ناراض رہتے ہیں۔ یہ سن کر عمر کھڑے ہوئے اور اپنی چادر ٹھیک طرح اوڑھی اور حفصہ کے پاس آئے اور کہا کہ اے بیٹی کیا یہ سچ ہے کہ تُو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں میں بول پڑتی ہے۔ یہاں تک کہ آپ دن بھر ناراض رہتے ہیں۔ حفصہ نے کہا خدا کی قسم ہم تو آپ کی باتوں کا جواب دے دیا کرتی ہیں۔ پس میں نے کہا یاد رکھ میں تجھے اللہ کے عذاب اور اس کے رسول کے غضب سے ڈراتا ہوں۔ اے بیٹی! تجھے اس بیوی کا طریق عمل دھوکے میں نہ ڈالے جسے اپنے حسن یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پر ناز ہے اور اس سے ان کی مراد حضرت عائشہ سے تھی۔

اس ٹکڑۂ حدیث کو نقل کر کے مصنّف ہفوات یہ اعتراض کرتے ہیں۔ اول رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان کہ جس بی بی کا دل خدا سے پھر گیا ہو اس پر آپ فریفتہ ہوں دوم جو بیوی خدا سے منحرف ہو وہ ان کی زوجیت میں رہ جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ سوم رسول اللہ پر ازواج کی یہ زیادتیاں ہوں کہ آپ کئی کئی دن غم و غصہ میں مبتلاء رہیں یعنی کارِ رسالت سے معطّل رہیں۔ ان ہفوات کو عقل انسانی ہرگز قبول نہیں کرتی۔

چونکہ عشق کے ہیڈنگ کے نیچے یہ حدیث لکھی گئی ہے۔ اور چونکہ اعتراضات میں عشق کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف ہفوات کے نزدیک عشق کے اعتراض کے علاوہ مزکورہ بالا حدیث پر یہ اعتراض پڑتے ہیں۔

اس حدیث سے عشق کا مفہوم نکالنا تو مصنّف ہفوات کی عقل میں ہی آسکتا ہے کیونکہ اس میں نہ عشق کا کوئی ذکر ہے نہ کوئی واقع اس میں ایسا لکھا ہے جس میں یہ اشارہ پایا جائے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ سے عشق تھا۔ ہاں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ حضرت عائشہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حفصہ کی نسبت زیادہ محبت تھی۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں جس سے عشق کا نتیجہ نکالا جائے یا جس پر کسی قسم کا اعتراض ہو سکے۔ حضرت عائشہ کی نیکی۔ ان کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فدائیت اور ان کے والد کی خدمات و قربانیاں ایسی نہ تھیں کہ ان کی وقعت کو دوسری بیویوں کی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں بڑھا نہ دیتیں۔ پس اس کی وجہ سے حضرت عائشہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زیادہ محبت کرنا قابل اعتراض امر نہیں بلکہ اس قدر دانہ طرز عمل پر روشنی ڈالتا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت ایک ممتاز نمونہ پیش کرتی ہے۔ اور اس اعتراض سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف صاحب ہفوات کی نظر میں محبت کا کوئی نہایت ہی غلط مفہوم بیٹھا ہوا ہے اور وہ اپنی جہالت کا غصہ ائمہ حدیث پر نکالنا چاہتے ہیں۔

دوسرا اعتراض بھی کہ جس بی بی کا دل خدا تعالیٰ سے پھر گیا ہو اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح فریفتہ ہو سکتے تھے۔ ایسا ہی غلط ہے جیسا کہ پہلا۔ کیونکہ قرآن کریم میں تو اس کی بجائے یہ بیان ہے کہ ان کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف مائل تھا۔ اور وہ اس کی رضا پر چلنے کے لئے بالکل تیار تھیں مصنف ہفوات خود ہی آیت کے ایک غلط معنے کر کے ائمہ حدیث پر اعتراض کرنے لگیں تو اس میں ائمہ حدیث کا کیا قصور ہے؟

وہ الفاظ قرآن جن سے مصنف ہفوات نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت عائشہ کا دل خدا تعالیٰ سے پھر گیا تھا یہ ہیں اِنْ تَتُوْبَآ اِلَی اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ [1] (ترجمہ) اگر تم اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ تو تمہارے دل تو جھک ہی چکے ہیں اور اگر تم دونوں اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو تو اللہ اس کا دوست ہے اور جبریل بھی اور مسلمانوں میں سے نیک لوگ بھی اور پھر اس کے ساتھ فرشتے بھی اس کے مددگار ہیں۔ اس آیت سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض بیویوں کے دل خدا سے پھر گئے تھے بلکہ اس کے برخلاف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان بیویوں کے دل اللہ تعالیٰ کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ کیونکہ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَی اللّٰهِ کے بعد فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلا فعل پہلے فعل کا باعث اور موجب ہے۔ اور یہ خیال کرنا کہ کسی شخص کا دل پھر جانا توبہ کا موجب اور باعث ہو گا عقل کے خلاف ہے۔ دل میں خشیت کا پیدا ہونا توبہ کا محرک ہوتا ہے نہ کہ دل کا خدا سے دور ہو جانا۔ پس فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تمہارے دل اللہ تعالیٰ سے پھر گئے ہیں۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ تمہارے دل تو پہلے ہی اللہ تعالیٰ کی طرف جھکے ہوئے ہیں۔ یعنی یہی کام تمہارا اصل کام ہے اور غلطی دل سے نہیں ہوئی بلکہ سہواً ہوئی ہے۔ ان معنوں کے سوا دوسرے کوئی معنے کرنے لغت عرب اور قواعد زبان کے بالکل خلاف ہیں اور ہرگز جائز نہیں اور تعجب ہے ان لوگوں پر جو تعریفی کلمات کو مذمت قرار دیتے ہیں۔

غرض اس آیت میں تو تعریف کی گئی ہے کہ اگر اے بیویو تم توبہ کرو تو تم اس کی اہل ہو۔ کیونکہ تمہارے دل پہلے ہی خدا کی طرف جھکے ہوئے ہیں۔ ہاں اگر توبہ نہ کرو تو ہمیں تمہاری پرواہ نہیں۔ اگر اس آیت کے وہ معنے لئے جاویں جنہیں مصنف صاحب ہفوات نے پسند کیا ہے تو یوں معنے ہوئے۔ اگر تم توبہ کرو تو تمہارے دل تو خدا سے دور ہو ہی چکے ہیں۔ اور اگر تم رسول کے خلاف کام کرو تو خدا اور مؤمن اور فرشتے اس کے مددگار ہیں کیا کوئی عقلمند اس فقرہ کی بناوٹ کو درست کہہ سکتا ہے کیونکہ مقابلہ کے فقروں میں دونوں حصوں کا مقابلہ ہوتا ہے لیکن ان معنوں کے رو سے پہلے فقرہ کے دوسرے حصہ کا مقابلہ کسی جملہ سے نہیں رہتا اور مزید برآں یہ عجیب مہمل بات بن جاتی ہے کہ اگر تم توبہ کرو تو تم تو پہلے ہی گناہ کی طرف مائل ہو چکی ہو کیا گناہ کی طرف میلان کے باعث توبہ نصیب ہوتی ہے یا خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے سے اور اس سے تعلق پیدا

کرنے سے۔ پس صحیح معنے وہی ہیں جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ اور ان کی رو سے آیت مذکورہ بالا سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بعض بیویاں رسول کریم کی اللہ سے دور ہو گئی تھیں۔ بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی وہ بیویاں دل سے نیک اور پرہیز گار تھیں۔ جو غلطی ان سے ہوئی تھی وہ سہواً اور بشریت کی کمزوری کے ماتحت تھی۔

دوسرا اعتراض مصنف صاحب ہفوات کا یہ ہے کہ جو بیویاں خدا سے منحرف ہوں وہ نبی کی زوجیت میں کس طرح رہ سکتی ہیں؟ یہ اعتراض تین وجہ سے باطل ہے۔

اول تو اس وجہ سے کہ حضرت نوح اور حضرت لوط کی بیویاں خدا سے دور تھیں مگر باوجود اس کے وہ ان کی زوجیت میں رہیں۔ اگر مصنف صاحب ہفوات اس صورت کا آخری حصہ پڑھ لیتے تو ان کو یہ ٹھوکر نہ لگتی مگر قرآن کا پڑھنا تو ان کے لئے نہایت مشکل ہے کیونکہ ان کے نزدیک حضرت عثمان نے اس میں بہت کچھ رخنہ اندازی کر دی ہوئی ہے (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِکَ) ان کے نزدیک تو قرآن کریم کی صرف وہی آیت قابل سند اور قابل مطالعہ ہے۔ جس میں سے وہ توڑ مروڑ کر کوئی اعتراض خدام اسلام پر کر سکیں۔

اسی سورۃ کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا وَّ قِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ [۴۲] (ترجمہ) اور اللہ تعالیٰ کافروں کی دو مثالیں بیان کرتا ہے۔ ایک تو نوح کی بیوی کی اور ایک لوط کی بیوی کی وہ دونوں ہمارے نیک بندوں کے نکاح میں تھیں مگر ان کے خلاف راستہ پر چلیں پس وہ دونوں نبی خدا کے عذاب سے ان کو ذرہ بھی نہ بچا سکے۔ اور ان دونوں سے کہا گیا کہ جس طرح باقی لوگ آگ میں داخل ہوتے ہیں تم بھی آگ میں داخل ہو جاؤ۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ باوجود خدا سے دور ہونے کے ایک عورت نبی کے نکاح میں رہ سکتی ہے کیونکہ مذہب اور عقیدہ کا تعلق نکاح کے ساتھ نہیں۔ (ہاں اہل اسلام کے لئے شرط ہے کہ صرف اہل کتاب سے شادی کریں) ظاہری اخلاق اور شرافت کا تعلق ہے۔ ایک بدکار اور فاحشہ عورت نبی کی بیوی نہیں رہ سکتی۔ لیکن مذہباً اگر وہ خراب ہے تو وہ نکاح میں رہ سکتی ہے۔

دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ جیسا کہ میں پہلے ثابت کر چکا ہوں۔ اس آیت کے یہ معنے ہی نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بیوی خدا سے دور ہو گئی تھی۔ بلکہ اس کے یہ معنے

ہیں کہ ان کا دل بالکل خدا کی طرف متوجہ تھا اور جو غلطی ہوئی تھی محض سہواً تھی پس یہ اعتراض اس جگہ پڑتا ہی نہیں۔

تیسرا جواب اس کا یہ ہے کہ یہ آیت تو قرآن کریم کی ہے۔ امام بخاری کی روایت تو نہیں جس پر اعتراض ہے۔ پس اعتراض امام بخاری پر نہیں اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اس میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ یا تو اس آیت کے معنے برے ہیں یا اچھے۔ اگر اس کے یہ معنے ہیں کہ آپ کی دو بیویاں خدا سے پھر گئی تھیں۔ اور اگر یہ درست ہے کہ خدا سے دور ہونے والی بیویاں نبی کی زوجیت میں نہیں رہ سکتیں تو پھر امام بخاری ہی کا یہ فرض نہیں کہ وہ یہ بتائیں کہ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو بیویوں کو الگ کیوں نہ کر دیا۔ بلکہ مصنف ہفوات کا بھی جب تک وہ مسلمان کہلاتے ہیں فرض ہے کہ بتائیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے حکم کے خلاف کام کیوں کیا۔ پس ان کا یہ اعتراض بخاری پر نہیں بلکہ درحقیقت قرآن کریم پر ہے کیونکہ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا بخاری کی روایت نہیں بلکہ قرآن کریم کی آیت کا ایک حصہ ہے۔

اور اگر اس آیت کے معنے اچھے ہیں اور اس میں ازواج مطہرات کی تعریف کی گئی ہے تو پھر مصنف ہفوات نے اس آیت کی بناء پر اعتراض کیوں کیا ہے؟ جب بیویاں نیک تھیں تو ان کے علیحدہ کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہی کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟

تیسرا اعتراض مصنف ہفوات کا یہ ہے کہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں آپ پر ایسی زیادتیاں کریں کہ کئی کئی دن تک آپ غم و غصہ میں مبتلاء رہیں اور کار رسالت سے معطل رہیں۔

اس اعتراض سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف صاحب ہفوات کا دماغ قوت ایجاد کا وافر حصہ رکھتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ ناپسند اور مکروہ باتوں کی ایجاد ہی میں مشغول رہتا ہے۔ اول تو حدیث میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں جس میں ازواج مطہرات کی زیادتیوں کا ذکر ہو۔ حدیث کے الفاظ سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے دستور کے خلاف اس حریت کی روشنی میں جو اسلام نے پھیلائی تھی۔ اور ان محبت کے تعلقات کے نتیجہ میں جو میاں بیوی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا کرنا چاہتے تھے۔ آپ کی بیویاں بعض دفعہ بعض معاملات میں آپ کو مشورہ دے دیا کرتی تھیں اور بعض دفعہ اس تعلق محبت کی بناء پر آپ پر اپنی بات کے منوانے کے لئے زور بھی دے دیا کرتی تھیں۔ کیا اس بات کا نام کوئی شخص زیادتی رکھ سکتا ہے؟ حدیث میں

الفاظ تُرَاجِعِیْنَ کے ہیں یعنی بات کا جواب دینا۔ اور واقعہ بتا رہا ہے کہ جواب دینے سے کیا مراد ہے۔ کیونکہ یہ بات حضرت عمرؓ کی بیوی نے کہی ہے اور اس کا واقعہ حضرت عمرؓ یہ بیان فرماتے ہیں کہ آپ کسی بات کو سوچ رہے تھے کہ آپ کی بیوی نے مشورۃً کوئی بات کہہ دی کہ جس امر میں آپ کو فکر ہے۔ آپ اس میں اس اس طریق سے کام کر سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کو دستور عرب کے مطابق عورت کا مشورہ میں دخل دینا ناپسند ہوا ہے اور آپ نے اسے ڈانٹا اس پر اس نے کہا کہ آپ کیوں ناراض ہوتے ہیں؟ اس طرح تو آپ کی بیٹی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کر لیا کرتی ہے۔ پس مراجعت کے معنے خود الفاظ حدیث سے ہی کھل جاتے ہیں یعنے بات میں دخل دے لینا نہ کہ تُو تُو مَیں مَیں کرنا اور لڑنا جو مضمون کہ مصنّف ہفوات نکالنا چاہتے ہیں حضرت عمرؓ کی بیوی نے کب حضرت عمرؓ کی کسی بات کو رد کیا تھا کہ اس کی نسبت یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اگر اس کے لئے یہ لفظ صرف مشورہ دینے پر بولا گیا ہے تو اس حدیث میں وہی لفظ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کی نسبت استعمال ہوا ہے تو اس کے وہی معنے کیوں نہ کئے جاویں اور کیوں اس کے معنے زیادتی کے کئے جاویں۔

باقی رہا یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بھی کہا گیا ہے کہ آپ اس جواب سے دن بھر ناراض رہتے تھے تو اول تو یہ حضرت عمرؓ کی بیوی کے لفظ ہیں اور ان کی تصدیق نہ حضرت عمرؓ نے کی ہے نہ حضرت حفصہ نے کیونکہ جب انہوں نے حضرت حفصہ کے سامنے واقعہ بیان کیا ہے تو انہوں نے اس امر کی تو تصدیق کی ہے کہ ہم آپ سے اصرار کر کے بات کر لیا کرتی ہیں لیکن اس کا اقرار نہیں کیا کہ آپ بھی سارا سارا دن ناراض رہتے ہیں۔ پس یہ ایک عورت کا خیال ہے اور اگر ہم یہ کہہ دیں کہ یہ خیال غلط تھا تو حدیث کی صحت یا امام بخاری کی شخصیت پر کوئی اعتراض نہیں پڑتا۔

دوسرے اگر اس امر کو نظر انداز بھی کر دیا جائے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ناراض رہنے کو بطور واقع بیان نہیں کیا گیا بلکہ ایک عورت کے خیال کے طور پر بیان کیا گیا ہے جس کی حضرت حفصہ تصدیق نہیں کرتیں تو بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں آپ پر کوئی زیادتی کرتی تھیں بلکہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ مشورہ میں کوئی ایسی بات کہہ بیٹھتی تھیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک کبھی مناسب نہیں ہوتی تھی۔ اور آپ اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرما دیتے تھے اور یہ بات ان دو شخصوں کے تعلقات میں جو اخلاق اور علم

میں فرق رکھتے ہوں پیدا ہو جانی بالکل معمولی ہے۔

دوسری ایجاد مصنف صاحب ہفوات کے دماغ کی یہ ہے کہ حدیث میں تو یہ لفظ ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس دن ناراض رہتے اور وہ اپنے اعتراض میں لکھتے ہیں کہ کئی کئی دن تک آپ غم و غصہ میں مبتلا رہتے۔

تیسری ایجاد مصنف ہفوات کی یہ ہے کہ حدیث میں تو لفظ غضب کا استعمال ہوا ہے جو اچھے اور برے دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت بھی استعمال ہو جاتا ہے جیسا کہ آتا ہے مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ [۴۳] اور انہوں نے اس لفظ کو بدل کر غم و غصہ کا لفظ استعمال کر دیا ہے تاکہ اعتراض مضبوط ہو جائے۔ کیونکہ غصہ کا لفظ عربی زبان میں بُرے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس لفظ کا مفہوم یہ ہے کہ جس شخص کے اندر یہ مادہ جوش میں آوے خود اس کو تکلیف ہو اور اس کا گلا گھُٹ جائے۔ اور یہ حالت صرف ان لوگوں کی ہوتی ہے جو جوش سے اندھے ہو جائیں اور ماسوا کو بھول جائیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ دوزخیوں کے کھانے کی نسبت آتا ہے وَ طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ [۴۴] وہ کھانا ان کو ملے گا جو ان کے گلے کو پکڑ لے گا اور نہ باہر نکل سکے گا نہ اندر جا سکے گا۔

لغت میں بھی یہی معنے کئے ہیں کہ غصہ اس حزن کو کہتے ہیں جو انسان کے گلے کو پکڑے [۴۵] یعنی اس کی حالت موت کی سی کر دے جیسے کسی کا گلا بند ہو جائے۔ پس یہ لفظ اللہ تعالیٰ اور اس کے نیک بندوں کی نسبت استعمال نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کا مفہوم ان کے اندر نہیں پایا جاتا اور حدیث میں یہ لفظ رسول کریمؐ کی نسبت استعمال نہیں ہوا بلکہ غضب کا ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی نسبت بھی استعمال ہو جاتا ہے۔

مصنّف ہفوات کے دماغ کی چوتھی اختراع یہ ہے کہ وہ اس حدیث سے یہ مطلب نکالتے ہیں کہ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت لکھا ہے۔ آپ اپنی بیویوں کی بات پر اظہار غضب کرتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ آپ کارِ رسالت سے معطّل ہو جاتے تھے۔ حالانکہ غضب کرنے اور کارِ رسالت سے معطّل ہونے کا کوئی بھی علاقہ نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مصنّف ہفوات نے محبت کا غلط مفہوم سمجھ کر پہلی حدیث پر اعتراض شروع کر دیا تھا اسی طرح غضب کا غلط مفہوم سمجھ کر دوسری حدیث پر اعتراض شروع کر دیا۔ اگر وہ قرآن کریم پر نظر ڈالتے تو ان کو اس قسم کے اعتراضات کر کے خود سُبکی نہ اٹھانی پڑتی اور دشمنانِ اسلام کو خوشی کا موقع نہ ملتا۔

میں ابھی لکھ چکا ہوں کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی نسبت قرآن کریم میں بار بار استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ بعض آیات اور لکھ دیتا ہوں جن سے معلوم ہو گا کہ خدا تعالیٰ بھی غضب کرتا ہے۔ سورۃ مجادلہ میں فرماتا ہے تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ [۶] سورۃ نساء میں ہے وَ غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ لَعَنَہٗ [۷] سورۃ فتح میں ہے وَ غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ [۸] اور اگر مصنّف ہفوات نماز کے فریضہ کے ادا کرنے کی طرف بھی کبھی متوجہ ہوتے ہیں تو ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ سورہ فاتحہ جسے ایک مسلمان کم سے کم بتیس دفعہ دن میں پڑھتا ہے اس میں غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ [۹] ایک قوم کی نسبت آتا ہے۔ اور اس غضب کی مدت قیامت تک ہے جیسا کہ فرماتا ہے وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْھِمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ مَنْ یَّسُوْمُھُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ اِنَّ رَبَّکَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِ وَ اِنَّہٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ [۱۰] ترجمہ: جب تیرے رب نے خبر دے دی کہ وہ ان لوگوں پر قیامت تک ایسے لوگ مقرر کرتا رہے گا جو ان کو سخت عذاب دیتے رہیں گے۔ ضرور تیرا رب جلد بُرے کام کا بدلہ دینے والا ہے۔ اور وہ ساتھ ہی بہت بخشنے والا اور مہربان بھی ہے۔ اب اگر غضب کرنے والا اپنے کام سے معطّل ہو جاتا ہے اور اسی صورت میں وہ غضب کر سکتا ہے جب اور کسی کی بات کی اسے ہوش نہ رہے تو کیا اللہ تعالیٰ بھی اپنے کام سے معطّل ہو جاتا ہے اور اگر باوجود اس کے کہ یہ لفظ بار بار اللہ تعالیٰ کی نسبت استعمال ہوا ہے اللہ تعالیٰ کی شان میں کچھ فرق نہیں آتا تو کیا رسول کی شان خدا سے بڑھ کر ہے کہ اگر اس کی نسبت یہ لفظ استعمال ہو جائے تو اس کی شان میں فرق آجاتا ہے۔

اگر یہ کہو کہ خدا تعالیٰ کی نسبت تو یہ الفاظ بطور استعارہ اور مجاز استعمال ہوتے ہیں اور بندوں کی نسبت اصل معنوں میں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی قاعدہ ایسا نہیں جس میں استعارہ اور مجاز کے استعمال کے لئے یہ حد لگائی گئی ہو کہ فلاں کے لئے وہ استعمال ہو سکتا ہے اور فلاں کے لئے نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کے لئے یہ لفظ بطور استعارہ استعمال ہوتے ہیں تو وہی لفظ اگر اللہ تعالیٰ کے رسول کی نسبت آگیا ہے تو اس کے حقیقی معنے اگر رسول کی شان کے خلاف ہیں تو ہم اسی طرح اس جگہ اس کے مجازی معنے لے لیں گے جس طرح اللہ تعالیٰ کی نسبت اس کے مجازی معنے لیتے ہیں۔

دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ مجاز اور استعارہ کے طور پر وہی لفظ کسی قدوس اور پاک ہستی کی نسبت استعمال کیا جاتا ہے جو پاک ہو۔ پس اگر مجازاً بھی غضب کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال کیا

جاتا ہو تب بھی یہ ماننا پڑے گا کہ وہ لفظ اعلیٰ سے اعلیٰ انسان کے لئے بولنا اس کی شان کے خلاف نہیں۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اس لفظ کا استعمال آپ کی شان کے خلاف نہیں۔ کیونکہ یہ کسی عیب پر یا کمزوری پر دلالت نہیں کرتا بلکہ غضب اس موقع پر ایک خوبی ہے جس کا پایا نہ جانا بے غیرتی پر دلالت کرتا ہے

مگر مصنف صاحب ہفوات کی تسلی کے لئے ہم استعارۃ اور مجاز کے عذر کو بھی قبول کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا انبیاء اور نیک لوگوں کے لئے اس لفظ کا استعمال قرآن کریم میں دکھا دیتے ہیں۔ سورۃ اعراف میں یہی لفظ حضرت موسیٰ کی نسبت آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ لَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْۢ بَعْدِیْ [51] اور جب موسیٰ اپنی قوم کی طرف ایسی حالت میں لوٹے کہ وہ ان پر غضبناک تھے اور ان کی حالت پر افسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ تم لوگوں نے میرے بعد میری جانشینی بہت بری طرح کی ہے۔ اس کے آگے چل کر فرمایا وَ لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ [52] اور جب موسیٰ کا غضب ٹھہر گیا تو انہوں نے تختیاں لے لیں۔ کیا ان آیات کے مطابق یہ سمجھنا چاہئے کہ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ حضرت موسیٰ طور سے واپس آئے اور اپنی قوم کے سمجھانے کے عرصہ میں کارِ نبوت سے معطل رہے تھے۔ اگر نہیں تو رسول کریم کی نسبت یہی لفظ اگر استعمال کیا گیا ہے تو اس کے معنی کارِ نبوت سے معطل ہونے کے کیونکر ہو گئے۔ کیا اس لئے کہ مصنف ہفوات نے امام بخاری کے پردہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو برا بھلا کہنے کی ایک سبیل نکالی ہے یا کم سے کم یہ کہ حدیثوں کی برائی ثابت کرنا ان کا اصل مقصد نہیں بلکہ اصل میں صحابہ اور ائمہ دین کو گالیاں دے کر اپنی طبیعت ثانیہ کے مقتضیٰ کو پورا کرنا مطلوب ہے۔

حضرت موسیٰ کے علاوہ یہی لفظ ایک اور نبی کی نسبت بھی استعمال ہوا ہے اور وہ یونسؑ نبی ہیں جن کو قرآن کریم میں ذوالنون کے لقب سے بھی یاد کیا ہے۔ ان کی نسبت سورۃ انبیاء میں آتا ہے وَ ذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ [53] (ترجمہ) اور ذوالنون کو بھی (ہم نے ہدایت دی تھی) جب کہ وہ غضبناک ہو کر اپنے علاقہ سے چلا اور اسے یقین تھا کہ ہم اس کے ساتھ سختی کا معاملہ نہیں کریں گے۔ پس اس یقین کی بنا پر اس نے مصائب کے وقت پکار کر کہا۔ تیرے سوا کوئی اور معبود نہیں تو پاک ہے اور میں تو ظالموں میں سے ہوں (یعنی اپنے نفس کو میں نے دکھ میں ڈال

دیا ہوا ہے) اس آیت میں بھی ایک نبی کی نسبت غضب کا لفظ استعمال ہوا ہے مگر باوجود اس کے وہ کارِ نبوت سے معطّل نہیں ہوا بلکہ نبی ہے اور نبیوں والا کام کر رہا ہے۔ لوگوں سے ناراض ہے مگر اللہ کی مدد کا کامل بھروسہ رکھتا ہے۔ دنیا کی تنگی کو دیکھ کر بھی یقین رکھتا ہے کہ خدا مجھے نہیں چھوڑے گا اور اس کی امداد کے حصول کے لئے اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور اس کے لئے الٰہی رحمت کا دروازہ کھولا جاتا ہے۔

یہی غضب کا لفظ مومنوں کی نسبت بھی استعمال ہوا ہے اور بصورتِ مدح استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سورۃ شوریٰ میں فرمایا ہے۔ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ [۵۴] جب ان کو کسی پر غضب آتا ہے تو اپنے غضب کے نتیجہ میں لوگوں کو سزا نہیں دیتے بلکہ باوجود غضب کے ان کے رحم کا پہلو غالب رہتا ہے اور وہ دوسروں کے قصوروں کو معاف کر دیتے ہیں۔ اس جگہ دیکھو مومنون کی تعریف میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ وہ غضب کے وقت سزا سے ہاتھ کھینچے رکھتے ہیں۔ اگر غضب کے معنے کارِ رسالت سے معطّل ہونے کے ہوتے تو یہ مؤمن کارِ مؤمنیت سے کیوں معطّل نہ ہو جاتے۔ اس جگہ سے تو معلوم ہو رہا ہے کہ غضب کے باوجود ایک مؤمن کا تعلقِ ایمان بھی قائم رہتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی جلوہ گری اپنے اندر پاتا ہے اور اس کے رحم کو اپنے اندر منعکس کر کے وہ لوگوں کے گناہ معاف کرتا ہے۔ تو پھر کیا نبیوں کے دل کا ظرف ہی اس قدر تنگ ہے کہ اس میں غضب کے آتے ہی باقی سب حواس وہاں سے غائب ہو جاتے ہیں اور ان کو پھر دنیا و ما فیہا بلکہ خدا اور عقبیٰ کی بھی کچھ فکر نہیں رہتی اور وہ کارِ نبوت سے معطّل ہو جاتے ہیں۔ اس عقل و دانش پر تعجب ہے اور اس علم پر ائمہ پر اعتراض کرنے کی جرأت موجبِ حیرت ہے۔ اور اس ستم ظریفی پر عقل دنگ ہے کہ آپ بایں علم و فہم لکھتے ہیں کہ ان ہفوات کو عقل انسانی ہرگز قبول نہیں کرتی۔

تیسری روایت مصنف ہفوات نے اس امر کی سند میں کہ ائمہ حدیث کے نزدیک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ سے عشق تھا بخاری کتاب النکاح سے نقل کی ہے۔ یہ روایت درحقیقت اسی واقع کے متعلق ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے اس لئے واقع کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس میں سے یہ الفاظ نقل کر کے مصنّف ہفوات نے اعتراض کیا ہے ثُمَّ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْرَأَيْتَنِيْ وَدَخَلْتُ عَلٰى حَفْصَةَ فَقُلْتُ لَهَا لَا يَغُرَّنَّكِ اَنْ كَانَتْ جَارَتُكِ اَوْضَأَ مِنْكِ وَاَحَبَّ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُرِيْدُ عَائِشَةَ فَتَبَسَّمَ النَّبِيُّ صَلَّى

اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ تَبَسُّمَۃً اُخْرٰی۔ [۵۵] میں نے کہا یا رسول اللہ دیکھئے تو سہی میں حفصہ کے پاس گیا اور میں نے اس سے کہا کہ تجھے کوئی بات دھوکا نہ دے کیونکہ تیری ہمسائی تجھ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ خوش رکھنے والی اور زیادہ پیاری ہے جس سے ان کی مراد حضرت عائشہ تھیں۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ اپنے خاص طرز میں مسکرائے۔

مصنّف ہفوات اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عوام کی طرح مبتلائے نفس امارہ تھے۔ اس عقل و دانش پر مجھے تعجب آتا ہے۔ اگر اس کا نام نفس امارہ ہے کہ کسی شخص سے جس سے خدا تعالیٰ نے رشتۂ محبت پیدا کیا ہے محبت کی جائے تو پھر وہ سب روایات جن میں حضرت علی اور حضرت فاطمہ اور حضرت حسن اور حضرت حسین سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ذکر آتا ہے وہ سب ہی نفس امارہ کی غلامی پر دلالت کرتی ہیں۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ۔ اور اگر کسی شخص سے دوسروں کی نسبت زیادہ محبت کرنا نفس کی غلامی ہے تو لَیُوْسُفُ وَ اَخُوْہُ اَحَبُّ اِلٰٓی اَبِیْنَا مِنَّا [۵۶] کی آیت کے ماتحت حضرت یعقوب نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ۔ نفس امارہ کے غلام ٹھہرے۔ افسوس کہ انسان تعصب میں اندھا ہو کر بالکل غور نہیں کر سکتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

مجھے اس اعتراض پر اور کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ محبت کے مضمون پر میں پہلے تفصیلاً لکھ آیا ہوں۔ ہاں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اس حدیث کو نقل کر کے مصنّف ہفوات نے جو چند فقرات بزعم خود اس کے مضمون کو ردّ کرنے کے لئے لکھے ہیں ان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان صاحب کا عندیہ اصل میں کیا ہے اور اس کتاب کی تصنیف کی حقیقی غرض کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔ اس روایت کو ابن عباس سے کتاب المظالم میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس حدیث میں حضرت عائشہ و حفصہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا کے راز فاش کرنے پر عتاب فرمانے کا بھی ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اوپر کی عشق بازی کی احادیث لغو و بہتان ہیں۔ دوم ابن ماجہ جلد سوم باب اسم اللہ الاعظم صفحہ ۲۲۵ میں حضرت عائشہ سے منقول ہے کہ آنحضرتؐ نے اسم اعظم کی تعریف کی تو حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے اس کے سکھانے کی فرمائش دو بار کی لیکن آپ نے انکار فرمایا۔ [۵۷] سوم مولوی حسن الزمان صاحب حیدر آبادی کی کتاب قول مستحسن کے صفحہ ۴۰۲ میں عوام بن حوشب کی روایت ہے کہ جناب عائشہ نے حضرت فاطمہ اور حسن و حسین کے ساتھ چادر تطہیر میں گھسنے کی درخواست کی تو آنحضرت نے فرمایا ہٹ جا۔

ان روایات کے نقل کرنے سے مصنّف کتاب کا منشاء سوائے حضرت عائشہ کی تحقیر کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور جو شخص بھی بِلا تعصّب کے اس کتاب کو پڑھے گا اسے ماننا پڑے گا کہ یہی ان کا منشاء ہے۔

گو اس کتاب کے موضوع سے چنداں اسے تعلق نہیں۔ لیکن چونکہ ان اعتراضات کو میں نے اس جگہ درج کر دیا ہے ان کا جواب بھی اس جگہ دے دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ امر اول۔ یعنی حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ پر عتاب کا ہونا کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ وہ عتاب خراب ہوتا ہے جو شرارت پر کیا جائے۔ لیکن جو عتاب غلطی پر کیا جائے وہ تو ایک سبق اور نصیحت ہے۔ نبی دنیا میں سکھانے کے لئے آتے ہیں۔ لوگوں میں کمزوریاں ہوتی ہیں۔ تبھی ان کی بعثت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر اس سے بڑے درجہ کے لوگوں کے لئے علوم روحانیہ کے سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کسی جگہ وہ ٹھوکر کھا جائیں تو ان کو تنبیہہ ہوتی ہے اور یہ تنبیہہ بطور تلطّف ہوتی ہے نہ بہ نظرِ تحقیر و عذاب۔ پس اگر حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کو جو تنبیہہ ہوئی ہے وہ عتاب میں ہے تو کوئی حرج نہیں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کا دل خدا ہی کی طرف مائل تھا۔ پس یہ تنبیہ ان کی عظمت پر دلالت کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خاص توجہ کی علامت ہے۔

دوسرا اعتراض کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو اسم اعظم نہیں سکھایا۔ اصل مضمون سے تعلق نہیں رکھتا۔ یہ بات کہ کسی شخص کو کسی دوسرے شخص سے سخت محبت ہے اس امر کا موجب نہیں ہوتا کہ وہ اسے ہر ایک بات بتا دے۔ مگر اس بات کے بیان کرنے سے چونکہ آپ کی یہ نیت ہے کہ حضرت عائشہ کی عظمت کو لوگوں کی نظروں میں کم کریں اس لئے میں اس کا جواب دے دینا بھی مناسب سمجھتا ہوں

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن ماجہ میں حضرت عائشہ سے یہ روایت مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو اسم اعظم نہیں سکھایا لیکن اس روایت سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اسم اعظم کوئی خاص شئے ہے جو نہایت پیاروں کو سکھائی جاتی ہے ایک حماقت کی بات ہے۔ اسم اعظم کوئی خاص شئے نہیں بلکہ اسم اعظم کے متعلق اس قسم کا خیال مسلمانوں میں یہود سے آیا ہے جو یہودا کے نام کا تلفظ اس قدر مشکل سمجھا کرتے تھے کہ سوائے عالموں کے دوسروں کے لئے اس نام کا لینا یا اس کا سکھانا جائز نہیں جانتے تھے (دیکھو جیوش انسائکلو پیڈیا وانسائیکلوپیڈیا بلیکا زیر لفظ نیمز NAMES) اور ان کا یہ خیال تھا کہ اس نام کو صحیح طور سے جو شخص بول سکے اس کی ہر ایک غرض

پوری ہو جاتی ہے مسلمانوں میں جب دیگر اقوام سے میل جول کے نتیجہ میں ان کے خیال اور وساوس داخل ہو گئے تو یہ خیال بھی یہود سے داخل ہو گیا اور صرف اسلامی الفاظ کے پردہ میں یہ یہودی عقیدہ عام مسلمانوں میں راسخ ہو گیا۔ ورنہ یہ خیال کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ایسا نام ہے جو اس کے بندے کے لئے مفید ہے اس کے انبیاء جو ہر ایک چیز کو جو انسانوں کے لئے مفید ہو ظاہر کر دیتے ہیں۔ اس نام کو چھپائے رکھتے ہیں۔ خدا اور اس کے رسولوں کی ہتک ہے۔ اسم اعظم درحقیقت اللہ کا لفظ ہے جو اسم ذات ہے اور تمام اسماء اس کے ماتحت ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہاں مختلف اشخاص کو ان کے مخصوص حالات کے مطابق بعض خاص اسماء سے تعلق ہوتا ہے اس وقت ان ناموں کو یاد کر کے دعا کرنا ان کے لئے بہت مفید ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا [۵۸] اس وقت موقع کے لحاظ سے ان اشخاص کے لئے وہی اسماء جن کی بلانے سے ان کی حاجت روائی ہوتی ہے ان کے لئے اسم اعظم بن جاتے ہیں خود اس حدیث کے ساتھ جو اور حدیث اسم اعظم کے متعلق مذکور ہیں انہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسم اعظم سے مراد کوئی خاص پوشیدہ نام نہیں ہے چنانچہ اس حدیث کے ساتھ عبداللہ بن بریدہ کی روایت درج ہے کہ ان سے ان کے والد نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو کہتے سنا اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِاَنَّکَ اَنْتَ اللّٰهُ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ وَ لَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَقَدْ سَاَلَ اللّٰهَ بِاِسْمِهِ الْاَعْظَمِ الَّذِیْ اِذَا سُئِلَ بِهٖ اَعْطٰى وَاِذَا دُعِیَ بِهٖ اَجَابَ۔ [۵۹] اس نے اللہ تعالیٰ کو اس کے اسم اعظم سے پکارا ہے جس کے ذریعہ سے پکارنے پر وہ سوال کو قبول کرتا اور پکار کا جواب دیتا ہے۔ پھر ساتھ ہی انس بن مالک کی روایت درج ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ کہتے سنا کہ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِاَنَّ لَکَ الْحَمْدُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ وَحْدَکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ الْمَنَّانُ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ تو فرمایا کہ لَقَدْ سَاَلَ اللّٰهَ بِاِسْمِهِ الْاَعْظَمِ الَّذِیْ اِذَا سُئِلَ بِهٖ اَعْطٰى وَاِذَا دُعِیَ بِهٖ اَجَابَ [۶۰] یعنی اس نے خدا تعالیٰ کو اس کے اس اسم اعظم سے پکارا ہے کہ اگر اس کے ذریعہ سے اس سے سوال کیا جائے تو وہ دیتا ہے اور اگر اسے پکارا جائے تو وہ جواب دیتا ہے۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ (ا) اسم اعظم کسی ایک اسم کا نام نہیں بلکہ ان اسماء کا نام ہے جن سے کسی خاص وقت میں دعا مانگنی زیادہ مفید ہوتی ہے کیونکہ مختلف لوگوں نے مختلف

دعاؤں اور ناموں سے اللہ تعالیٰ کو مخاطب کیا ہے اور ان کا نام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسم اعظم رکھا ہے (۲) یہ اسم اعظم کوئی پوشیدہ امر نہیں ورنہ رسول کریم لوگوں کو یہ کیوں بتاتے کہ ان لوگوں نے اسم اعظم کو یاد کر کے دعا مانگی ہے۔ آپ کو تو چاہئے تھا کہ اگر اتفاقاً کسی کے منہ سے اسم اعظم نکل گیا تھا تو چپ کر رہتے۔ (۳) جب کہ آپ علی الاعلان اسم اعظم کی تلقین کرتے تھے تو ممکن نہ تھا کہ حضرت عائشہ سے چھپاتے کیونکہ وہ دوسروں سے سن سکتی تھیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں بعض لوگوں کی خاص حالت کے مطابق بعض اسماء ہوتے ہیں اور وہی ان کے لئے اسم اعظم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس حدیث میں جس پر صاحب ہفوات نے اعتراض کیا ہے اسی قسم کے اسم کا ذکر ہے اور اس میں یہ جو بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ نام بتایا ہے جس کے ذریعہ سے اگر اس سے دعا کی جائے تو وہ قبول کرتا ہے۔ اس سے مراد آپ کی اسی اسم سے تھی۔ جو آپ کے ذاتی امور کے ساتھ مناسبت رکھتا تھا یہ اسم یا بطور الہام یا بطور القاء ہی معلوم کرایا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ نے اس سے فائدہ اٹھا کر کسی ایسے امر کے متعلق دعا کرنی چاہی ہے جو ان میں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان مشترک تھا۔ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت معلوم ہو چکا تھا کہ وہ امر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے خلاف ہے آپ نے حضرت عائشہ کو وہ نام نہیں بتایا کہ کہیں جوش میں اس امر کے متعلق وہ دعا نہ کر بیٹھیں۔ لیکن حضرت عائشہ نے اپنے عمل سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت کا ثبوت دے دیا۔ اور ایسی جامع مانع دعا کی جو اسم اعظم پر مشتمل تھی اور خدا تعالیٰ سے کوئی دنیاوی چیز نہیں مانگی بلکہ اس کی مغفرت اور رحم ہی مانگا۔ چنانچہ اس حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کی دعا پر ہنس پڑے اور فرمایا کہ اسم اعظم تیری دعا میں شامل تھا۔ پس جب کہ حضرت عائشہ کی زبان پر بسبب ان کی کامل اتباع کے اللہ تعالیٰ نے خود بطور القاء کے وہ اسم جاری کر دیا جو ان کے مناسب حال تھا۔ تو کیسا نادان ہے وہ شخص جو حضرت عائشہ کے درجہ پر اس حدیث کے ذریعہ سے اعتراض کرتا ہے یہ حدیث تو آپ کے بلند درجہ اور اعلیٰ مقام پر دلالت کرتی ہے۔اور آپ کو جو محبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی اس پر شاہد ہے نہ کہ اس سے آپ کی شان کے خلاف کوئی استدلال ہوتا ہے۔

اس کے بعد آپ نے حضرت عائشہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی نفی کے

ثبوت میں قول مستحسن کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ عمیر بن حوشب کی روایت ہے کہ جب عائشہ نے حضرت فاطمہ اور حسن اور حسین کے ساتھ چادر تطہیر میں داخل ہونے کی درخواست کی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پرے ہٹ جا اس روایت کے متعلق مجھے اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ چادر تطہیر شیعہ محاورہ ہے۔ چادر تطہیر کا ثبوت قرآن کریم سے نہیں ملتا۔ قرآن کریم میں تو ایک وعدہ تطہیر بیان ہوا ہے اس کا کسی چادر کے ساتھ تعلق نہیں۔ شیعان علی نے نہیں کیونکہ وہ نیک اور پارسا لوگ تھے بلکہ بعض شیعان نفسانیت نے اہل بیت کے معنے حقیقت سے پھیرنے کے لئے جو روایات گھڑی ہیں ان میں چادر تطہیر کا ذکر آتا ہے اور ان کی عبارتیں ہی بتاتی ہیں کہ ان سے محض امہات المؤمنین کی ہتک اور لوگوں کی عقل پر پردہ ڈالنا مقصود ہے۔ قرآن کریم میں صریح طور پر بیویوں کو اہل بیت کہا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ ہود میں ان رسولوں کے ذکر میں جو لوط کی قوم کی ہلاکت کے لئے مبعوث ہوئے تھے حضرت سارہ کو جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی تھیں اہل بیت کہہ کر پکارا گیا ہے وہ لوگ حضرت سارہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ [۶۱] یعنی کیا تو تعجب کرتی ہے اللہ کے فیصلہ پر تم پر تو اے اہل بیت! اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور اس کی برکات ہیں اللہ تعالیٰ یقیناً بہت تعریف والا اور بڑی بزرگیوں کا مالک ہے۔ لیکن ان روایات میں صاف الفاظ میں بیویوں کے اہل بیت ہونے سے انکار کیا گیا ہے۔ پس ان خلاف قرآن روایات کو کون مسلمان تسلیم کر سکتا ہے۔ یہ اقوال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں ہیں۔ بلکہ ان لوگوں کی افترا پردازیاں ہیں جو باوجود سخت وعیدوں کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے سے نہیں جھجکتے تھے۔

مگر جھوٹ چھپ نہیں سکتا۔ اول تو قرآن کریم سے ہی ان کی یہ روایات ٹکرا جاتی ہیں اور اس لئے قابل قبول نہیں۔ دوسرے خود آپس میں یہ روایتیں سخت ٹکراتی ہیں۔ مثلاً یہی واقعہ پندرہ بیس راویوں سے مذکور ہے اور مختلف روایتوں میں اس قدر سخت اختلاف ہے کہ ان میں تطبیق کی کوئی صورت نہیں۔ حضرت ام سلمہ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ یہ آیت ان کے گھر میں نازل ہوئی ہے حضرت عائشہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ گویا ان کے گھر نازل ہوئی ہے۔ کسی روایت میں ہے کہ جس وقت آیت تطہیر اتری تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ اور حضرت حسنین اور علی کو ام سلمہ کے گھر میں بلا کر ان کو چادر میں داخل کیا۔ کسی میں ہے

کہ آپ نے خود ان کے گھر میں جا کر ان کو ایک چادر میں جمع کر کے ان پر یہ آیت پڑھی۔ پھر کسی روایت میں ہے کہ ام سلمہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ مجھے اس چادر میں داخل کروا اور آپ نے داخل نہ کیا۔ اور کسی میں ہے کہ عمیر بن حوشب کہتے ہیں کہ عائشہ نے کہا تھا کہ مجھے داخل کرو اور آپ نے داخل نہ کیا۔ اس اختلاف سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیت کی محبت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں نے وقتی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے یہ روایات بنائی ہیں اس لئے دروغ گو را حافظہ نہ باشد کے اصل کے مطابق وہ اپنے بیان میں کوئی مابہ الاشتراک پیدا نہیں کر سکے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ایک روایت میں تو یہ بیان ہوتا ہے کہ ام سلمہؓ نے کہا کہ میں نے خود چادر تطہیر میں داخل ہونا چاہا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔ مگر عمیر بن حوشب کی روایت کے مطابق حضرت عائشہ نے داخل ہونا چاہا مگر اجازت نہ ملی۔ کیا یہ اس امر کا ثبوت نہیں کہ ایک وضاع نے اگر حضرت ام سلمہ کی ہتک کرنی چاہی ہے۔ تو دوسرے نے حضرت عائشہ کی۔

علاوہ ازیں حضرت عائشہ کی جو حدیث مصنف ہفوات نے درج کی ہے اس سے حضرت عائشہ کی ہرگز ہتک ثابت نہیں ہوتی بلکہ آپ کی رفعت ثابت ہوتی ہے۔ ہاں مصنف ہفوات نے اپنے ترجمہ میں ہتک کا مضمون پیدا کرنے کی کوشش بے شک کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ جب حضرت عائشہ نے چادر تطہیر میں داخل ہونا چاہا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کے لہجہ میں فرمایا چل دور ہو تو اپنے درجہ پر ٹھیک ہے۔ یہ ترجمہ خواہ ان کا ہے یا قول مستحسن والے کا جس کے حوالہ سے انہوں نے یہ روایت نقل کی ہے بالکل غلط ہے۔ انہوں نے خود ہی الفاظ حدیث درج کئے ہیں جو یہ ہیں۔ قَالَ تَنَحَّیْ فَاِنَّکِ خَیْرٌ ان الفاظ میں غصہ سے کہا کے الفاظ ہرگز موجود نہیں ہیں۔ اور نہ "چل دُور ہو" کے ہیں اور نہ یہ کہ تو اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ یہ تینوں باتیں اپنے پاس سے بنا کر داخل کر دی گئی ہیں۔ الفاظ حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ ایک طرف ہو جاؤ تم بہت ہی اچھی ہو جس کے اگر کوئی معنے نکل سکتے ہیں تو صرف یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ تم میں تو پہلے سے ہی خیر موجود ہے۔ تمہیں چادر تطہیر میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ خواہ الفاظ کچھ ہوں۔ یہ احادیث بعض نام نہاد محبان اہل بیت نے حقیقی اہل بیت کو بدنام کرنے کے لئے وضع کی ہیں۔

اس جگہ کسی کو شائد یہ شبہ گزرے کہ اس بیان سے تو معلوم ہوا کہ بعض احادیث جھوٹی بھی

ہوتی ہیں پھر اعتبار کیا رہا؟ مگر یاد رہے کہ اس شبہ کا ازالہ میں پہلے کر آیا ہوں کہ باوجود بعض احادیث کے غلط ہونے کے حدیثوں پر اس حد تک اعتبار کیا جاسکتا ہے جس حد تک وہ اپنی ضرورت کو پورا کر رہی ہیں۔ اس سے زیادہ نہ ان پر اعتبار کیا جاسکتا ہے اور ان کی ضرورت ہے۔ اسلام کے اصول قرآن کریم اور سنت سے ثابت ہیں اور احادیث صرف سنت کی مؤید اور اس پر ایک تائیدی گواہ کے طور پر ہوتی ہیں۔ دوسرے امور کے متعلق وہ بحیثیت ایک معتبر تاریخ کے شاہد ہوتی ہیں۔ اور جس طرح معتبر سے معتبر تاریخ میں غلطیاں پائی جاتی ہیں لیکن اس کے فائدہ سے انکار نہیں ہو سکتا اسی طرح ان میں بھی غلطیاں پائی جاتی ہیں لیکن اس کے فائدہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ حدیث میں یہ خوبی ہے کہ اس کے جمع کرنے میں جو احتیاط برتی گئی ہے اس کے سبب سے یہ یورپ کی تاریخوں کا تو ذکر ہی کیا ہے اسلامی زمانہ کی مدوّن شدہ تاریخوں سے بھی بعض حیثیتوں میں زیادہ معتبر ہے اور اس میں جھوٹ کا معلوم کرلینا آسان ہے۔

اگر کہا جائے کہ پھر مصنف ہفوات میں اور ہم میں اختلاف کیا ہے۔ انہوں نے بھی بعض احادیث کو ہی جھوٹا قرار دیا ہے اور ہم نے بھی تسلیم کرلیا ہے کہ بعض احادیث جھوٹی ہو سکتی ہیں بلکہ جھوٹی ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم میں اور مصنف ہفوات میں بہت سے فرق ہیں۔ اول یہ کہ انہوں نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ بعض احادیث کے غلط ہونے سے کتب احادیث کا ہی اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ اور یہ بات جیسا کہ میں ثابت کرچکا ہوں بالبداہت باطل ہے۔ دوم یہ کہ انہوں نے بعض احادیث پر اعتراض کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان کتب کے مصنفین جن میں وہ احادیث پائی جاتی ہیں جھوٹے اور فریبی اور دشمن اسلام تھے اور ان کی کتب کا اعتبار کر کے دوسرے مسلمان بھی ان کے ہم نوا ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں ثابت کرچکا ہوں یہ بات غلط ہے بہت سی حدیثیں جن کو ہم غلط سمجھتے ہیں ان کو غلط سمجھتے ہوئے ہی محدثین نے اپنی کتب میں درج کیا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی کتب میں اضداد مطالب کی احادیث ایک ہی جگہ جمع نظر آتی ہیں۔ انہوں نے تحقیق کا ایک معیار مقرر کیا ہے اور اس معیار کے مطابق جو حدیث ان کو ملی ہے خواہ بعض دوسرے طریقوں سے اس کی کمزوری ہی ثابت ہوتی ہو انہوں نے اس کو اپنی کتاب میں لکھ دیا ہے اور یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا باستثناء ایک دو کتب احادیث کے کہ ہر ایک حدیث جو کسی حدیث کی کتاب میں پائی جاتی ہے اس کا مؤلف اسے ضرور صحیح ہی تسلیم کرتا تھا۔ وہ صرف یہ خیال کرتا تھا کہ میرے مقرر کردہ معیار کے چونکہ یہ حدیث مطابق آتی ہے مجھ پر دیانتداری سے اس کا لکھ دینا فرض ہے اور بس۔

پس باوجود بعض کمزور یا وضعی احادیث کے پائے جانے کے کتب احادیث کے اکثر مصنفین کے درجہ اتقاء میں فرق نہیں آتا۔ ان میں سے بعض اپنے اپنے زمانہ کے لئے رکن اسلام تھے اور اولیاء اللہ میں تھے اور ان کو گالیاں دینے والا خود تقویٰ اور طہارت سے بے بہرہ ہے۔ اور اگر فرض بھی کرلیا جائے کہ بعض احادیث انہوں نے صحیح سمجھ کر لکھیں۔ لیکن وہ صحیح نہ تھیں۔ اور بعض احادیث کے متعلق یہ سمجھ لینا بالکل قرین قیاس ہے بلکہ قیاس کا غالب پہلو اسی طرف ہے تو بھی چند ایک غلطیوں سے بشرطیکہ وہ غلطیاں سہو و خطاء کی حد میں ہوں اور شرارت کا نتیجہ نہ ہوں ایک شخص کے نہایت مفید کام اور عمر بھر کی قربانی کی تحقیر نہیں کی جاسکتی۔

سوم یہ فرق ہے کہ مصنف ہفوات کی غرض یہ نہیں ہے کہ بعض غلط اور کمزور احادیث کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائیں۔ بلکہ ان کی غرض اس پردہ میں ائمہ اسلام اور اہل بیت میں سے پہلے مخاطبین کی ہتک کرنا ہے اور وہ صحیح احادیث کو جان بوجھ کر اپنے اصل مطلب سے پھرا کر دوسرا رنگ چڑھا کر پیش کرتے ہیں تا اہل سنت والجماعت پر بزعم خود پھبتی اُڑائیں اور ان کی تضحیک کریں اور ان کی غرض کسی غلطی کی اصلاح نہیں ہے بلکہ غلطیاں پیدا کر کے ان کی اُلجھن میں لوگوں کو پھنسانا ہے۔ چنانچہ اکثر احادیث سے جو انہوں نے منتخب کی ہیں بالکل صاف اور واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ صرف بُغض اور تعجب کی وجہ سے انہوں نے ان کو اپنے اصل مطلب سے پھیر کر ائمہ حدیث اور ازواج مطہرات اور صحابہ کرام کو گالیاں دینے کا ایک ذریعہ پیدا کیا ہے۔

چہارم یہ فرق ہے کہ ان کا خیال ہے کہ صرف کتب اہل سنت میں اس قسم کی غلط روایات داخل ہو گئی ہیں حالانکہ شیعہ کتب بھی اس قسم کی احادیث سے بھری پڑی ہیں بلکہ اہل سنت کی کتب سے بہت زیادہ کمزور اور وضعی احادیث ان میں موجود پائی جاتی ہیں۔

غرض باوجود بعض احادیث کو غلط ماننے کے ہمارے اور مصنف ہفوات کے خیالات ایک نہیں بلکہ دونوں خیالات میں بعد المشرقین ہے اور ایک خیال اسلام کو اس کی اصل شکل میں دنیا کے سامنے لاتا ہے تو دوسرا اس کو دشمنان اسلام کی نظروں میں نہایت مکروہ اور بھیانک کرکے دکھاتا ہے

بہتان اقدام زنا و طلبی مہ جبیں

مصنف ہفوات نے ایک الزام ائمہ حدیث پر یہ لگایا ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک حسین عورت کے طلب کرنے کا الزام لگایا ہے اور اس کے بعد ایک اور الزام یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اقدام زنا کا بھی الزام لگایا

ہے۔ اور پہلی بات کی تصدیق کے لئے بخاری کی ایک حدیث جس کے راوی سہل بن سعد ہیں اور جو کتاب الاشربۃ کے بَابُ الشُّرْبِ مِنْ قَدْحِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ میں درج ہے۔ لکھی ہے اور دوسرے الزام کی تصدیق کے لئے بخاری کی ایک اور روایت جو ابو سعید سے مروی ہے اور کتاب الطلاق میں درج ہے بیان کی ہے۔

گو مصنّف ہفوات نے یہ اعتراض الگ الگ ہیڈنگوں کے نیچے اور الگ روایتوں کی سند سے لکھے ہیں۔ لیکن میں ان کا جواب اکٹھا ہی دینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ ان کو الگ الگ اعتراض مصنّف ہفوات کی بوالہوسی نے بنا دیا ہے ورنہ یہ دونوں اعتراض ایک ہی ہیں اور یہ دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں اور ان کو الگ الگ واقعات سمجھنا یا تو مصنّف ہفوات کے بڑھے ہوئے بغض پر دلالت کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ کسی بات کے سمجھنے سے بالکل معذور ہو گئے ہیں اور یا اس پر شاہد ہے کہ وہ علم حدیث سے بالکل کورے ہیں اور صرف کتابیں کھول کر نقل کر دینے کی عادت رکھتے ہیں اور اس نقل میں بھی عقل سے کام نہیں لے سکتے۔ جن لوگوں نے کوئی ایک کتاب بھی حدیث کی پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ ایک واقعہ کو کئی کئی آدمیوں نے بیان کیا ہے اور ان مختلف لوگوں کی روایت کی وجہ سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ واقعہ دو ہیں۔ اگر ایک واقعہ کو سو آدمی دیکھ کر اپنے اپنے دوستوں کے سامنے بیان کریں تو وہ سو واقعات نہیں ہو جاتے۔ جیسا کہ ظاہر ہے ان دو حدیثوں میں ایک ہی واقعہ دو راویوں کی زبان سے بیان ہوا ہے۔ اور جیسا کہ میں آگے ثابت کروں گا یہ ایسی ثابت شدہ بات تھی کہ مصنّف صاحب ہفوات اگر علم حدیث سے محض نابلد اور جاہل آدمی نہیں ہیں تو ان کو اس کا علم ہونا چاہئے تھا۔ اور اگر ان کو اس کا علم تھا تو اس صورت میں صرف یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ اعتراضوں کی تعداد بڑھانے کے لئے انہوں نے ایک واقعہ کو دو بنا دیا ہے۔

جن حدیثوں پر مصنّف ہفوات نے اعتراض کیا ہے اور جو اعتراض ان پر کئے ہیں ان کو بیان کر کے میں بتاتا ہوں کہ انہوں نے کس جہالت یا دھوکا دہی کا ثبوت دیا ہے پہلی حدیث وہ یہ لکھتے ہیں عَنْ سَھْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ ذُکِرَ لِلنَّبِیِّ ﷺ امْرَأَۃٌ مِنَ الْعَرَبِ فَاَمَرَ اَبَا اُسَیْدِ السَّاعَدِیَّ اَنْ یُّرْسِلَ اِلَیْھَا فَاَرْسَلَ فَقَدِمَتْ فَنَزَلَتْ فِیْ اُجُمِ بَنِیْ سَاعِدَۃَ فَخَرَجَ النَّبِیُّ ﷺ حَتّٰی جَاءَ ھَا فَدَخَلَ عَلَیْھَا۔ الخ میں مضمون کو سمجھانے کے لئے جو حصہ حدیث کا مصنّف ہفوات نے چھوڑ دیا ہے اس کو بھی لکھ دیتا ہوں۔ آگے لکھا ہے فَاِذَا امْرَأَۃٌ

مُنَكِّسَةٌ رَأْسَهَا فَلَمَّا كَلَّمَهَا النَّبِيُّ ﷺ قَالَتْ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ فَقَالَ قَدْ اَعَذْتُكِ مِنِّيْ فَقَالُوْا لَهَا اَتَدْرِيْنَ مَنْ هٰذَا قَالَتْ لَا قَالُوْا هٰذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَاءَ لِيَخْطُبَكِ قَالَتْ كُنْتُ اَنَا اَشْقٰى مِنْ ذٰلِكَ۔ [۱۲] ترجمہ۔ سہل بن سعد بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس عرب کی ایک عورت کا ذکر کیا گیا۔ پس آپ نے ابواُسید الساعدی کو حکم فرمایا کہ اس کو بلوا بھیجے۔ انہوں نے بلوا بھیجا۔ جب وہ آئی تو بنو ساعدہ کے قلعے میں اتری اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف تشریف لے گئے۔ جب وہاں پہنچے اور اس کے پاس گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عورت سر جھکائے بیٹھی ہے۔ جب آپ نے اس سے کلام کیا تو اس نے کہا کہ میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔ آپ نے فرمایا میں نے تجھے اپنے سے پناہ دی۔ اس پر لوگوں نے اس سے کہا کیا تو جانتی ہے یہ شخص کون تھا؟ اس نے کہا نہیں انہوں نے کہا یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو تجھ سے نکاح کی درخواست کرنے آئے تھے۔ اس نے کہا میرے جیسی بدبخت آپ کے لائق کہاں۔

کیا کوئی شخص ساری حدیث کو پڑھ کر کہہ سکتا ہے کہ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر کوئی الزام لگایا گیا ہے اگر اس حدیث سے کوئی استدلال کیا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ آپ ایک عورت کے پاس گئے اور اسے نکاح کا پیغام دیا۔ لیکن اس بدبخت نے کسی کے سکھانے سے یا اپنے نفس کی شرارت سے نہ صرف نکاح سے انکار کیا بلکہ نہایت بُرے لفظوں میں انکار کیا اور اس پر آپ بلا کچھ کہے واپس تشریف لے آئے کیونکہ شرعاً عورت کا حق ہے کہ وہ اپنی رضامندی سے نکاح کرے کوئی اسے کسی خاص جگہ نکاح کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا (میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ فی الواقع یہ استدلال بھی درست نہیں کیونکہ اس عورت سے آپ کی شادی ہو چکی تھی) اور پھر اگر اس حدیث سے کچھ معلوم ہوتا ہے تو یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ بادشاہوں سے بالکل مختلف تھا ان کی خواہش کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی میں اس امر کی بالکل پرواہ نہیں فرماتے تھے کہ کوئی شخص آپ کی نسبت ہتک آمیز الفاظ کہہ دے۔

یہ ٹکڑا حدیث کا کس طرح وضاحت سے بتا دیتا ہے کہ مصنف ہفوات کی نیت نیک نہیں بلکہ بد ہے کیونکہ وہ اتنا تو بیان کر دیتا ہے کہ ایک عورت کا ذکر کیا گیا اور آپ نے اس کو بلوایا اور اس کے پاس تشریف لے گئے لیکن اس کا اگلا حصہ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ آپ ایک جماعت سمیت اس

کے پاس گئے تھے اور یہ کہ آپ اس کو نکاح کا پیغام دینے گئے تھے اس کو اس نے بالکل چھوڑ دیا تاکہ یہ سمجھا جائے حدیث کا یہ مطلب ہے کہ آپ کسی بدنیتی سے گئے تھے بلکہ اس قدر دلیری سے کام لیا ہے کہ اس اعتراض کو الفاظ میں بھی بیان کر دیا ہے۔ یورپ کے لوگ بھی اسلام پر اعتراض کرتے ہیں۔ مگر میں نے ایسی بے حیائی ان کی طرف سے بھی نہیں دیکھی کہ اس قدر صریح امر کو آدھا بیان کر کے انہوں نے اس پر اعتراض جمائے ہوں۔ شاید یہ مصرع کہ "چہ دلا درست دزدے کہ بکف چراغ دارد"، مصنف ہفوات کی قسم کے لوگوں کو ہی مدنظر رکھ کر کہا گیا ہے۔

گو یہ حدیث ہی مصنف ہفوات کے اعتراض کو رد کر دیتی ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے پچھلے حصہ کو اُڑا دیا ہے تاکہ ان کے اعتراض کا پول نہ کُھل جائے۔ لیکن میں ابھی دلائل سے ثابت کروں گا کہ مصنف ہفوات نے جان بوجھ کر اس واقعہ کو بگاڑ کر پیش کیا ہے اور ائمہ حدیث پر ہاتھ صاف کرنے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت اور احترام کا بھی پاس نہیں کیا۔

دوسری حدیث جس کو مصنف ہفوات نے الگ واقعہ کے طور پر پیش کیا ہے اور جو درحقیقت اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے یہ ہے۔ عَنْ اَبِیْ اُسَیْدٍ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی انْطَلَقْنَا اِلٰی حَائِطٍ یُقَالُ لَہُ الشَّوْطُ حَتّٰی انْتَھَیْنَا اِلٰی حَائِطَیْنِ فَجَلَسْنَا بَیْنَھُمَا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِجْلِسُوْا ھٰھُنَا وَدَخَلَ وَقَدْ اُوتِیَ بِالْجَوْنِیَّۃِ فَاُنْزِلَتْ فِیْ بَیْتٍ فِیْ نَخْلٍ فِیْ بَیْتِ اُمَیْمَۃَ بِنْتِ النُّعْمَانِ بْنِ شَرَاحِیْلَ وَمَعَھَا دَایَتُھَا حَاضِنَۃٌ لَھَا فَلَمَّا دَخَلَ عَلَیْھَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ ھَبِیْ نَفْسَکِ لِیْ قَالَتْ وَھَلْ تَھَبُ الْمَلِکَۃُ نَفْسَھَا لِلسُّوْقَۃِ قَالَ فَاَھْوٰی بِیَدِہٖ یَضَعُ یَدَہٗ عَلَیْھَا لِتَسْکُنَ فَقَالَتْ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْکَ فَقَالَ قَدْ عُذْتِ بِمَعَاذٍ ثُمَّ خَرَجَ عَلَیْنَا فَقَالَ یَا اَبَا اُسَیْدٍ اکْسُھَا رَازِقِیَّتَیْنِ وَاَلْحِقْھَا بِاَھْلِھَا [۶۳] (ترجمہ) ابواُسید رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ ہم ایک دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اور ایک باغ کا رخ کیا جسے شوط کہتے ہیں۔ جب ہم دو باغوں کے درمیان پہنچے تو ان کے درمیان میں بیٹھ گئے آپ نے فرمایا یہاں بیٹھے رہو اور آپ باغ کے اندر داخل ہوئے اور اس جگہ جونیہ پہلے سے ایک گھر میں جو کھجوروں کے درختوں میں تھا لا کر رکھی گئی تھی آپ داخل ہوئے امیمہ بنت نعمان بن شراحیل کے گھر میں (یہ جونیہ کا ہی نام ہے جونیہ اس کے قبیلہ کی نسبت کی وجہ سے اس کو کہا جاتا تھا) اور اس کے ساتھ اس کی دایہ یعنی کھلائی تھی پس جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا کہ

اپنے نفس کو مجھے ہبہ کر دے تو اس نے جواب دیا کہ کیا ملکہ اپنے آپ کو عام آدمیوں کے سپرد کرتی ہے۔ ابو اسید رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تا اس پر اپنا ہاتھ رکھیں اور اس کا دل تسکین پائے اس پر اس نے کہا میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں اس بات کو سن کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تُو نے اس کی پناہ مانگی ہے جو بڑا پناہ دینے والا ہے۔ پھر آپ باہر ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا اے ابا اسید اس کو دو چادریں دیدو اور اس کے گھر والوں کے پاس اسے پہنچا دو۔

اس حدیث کو نقل کر کے مصنف ہفوات نے یہ اعتراض کئے ہیں۔ (۱) اس حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اقدام زنا کا الزام لگایا گیا ہے (۲) زن اجنبیہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ بڑھایا (۳) محصنہ اجنبیہ (یعنی اجنبی بن بیاہی عورت) نے دُہائی دے کر اپنا پیچھا چُھڑایا۔

مگر ان اعتراضات پر ہی آپ کی تسلی نہیں ہوئی ایک آریہ رام سنگھ بی اے کی زبانی ایک لمبا طومار اعتراضات کا اس حدیث پر لکھ مارا ہے یعنی (۱) ایک عورت کو بستی سے الگ آبادی سے دور باغ میں بلوایا گیا (۲) بِلا پیسے ٹکے قبضہ میں لانا چاہا (۳) اس کو یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ آپ ہیں کون (۴) جب اس عورت نے انکار کیا تو اس کی طرف زبردستی کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا گیا (۵) پھر اس بے حجابانہ ملاقات کے صلہ میں اس عورت کو بیت المال میں سے معاوضہ دیا گیا۔

آریہ بے چارہ کا تو نام پردہ ڈالنے کے لئے لیا گیا ہے درحقیقت یہ اعتراضات بھی خود مصنّف ہفوات کی طرف سے ہی ہیں۔ مجھے تعجب آتا ہے کہ اس عقل و دانش اور علم و فہم پر آپ کو کتاب لکھنے اور پھر ائمہ اسلام کے منہ آنے کی کیا سوجھی تھی۔ اس حدیث میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے ظاہر ہو کہ جونیہ کو شہر سے باہر ویرانہ میں بلایا گیا تھا یا یہ کہ وہ زن اجنبیہ تھی یا یہ کہ اس سے زبردستی کی گئی یا یہ کہ اسے بیت المال سے روپیہ دیا گیا تھا۔ بلکہ اس کے برخلاف الفاظ حدیث سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آباد جگہ بلکہ چوراہے پر اتاری گئی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک جماعت مسلمین سمیت اس کے گھر تشریف لے گئے تھے۔ خود اس کے ساتھ بھی ایک دایہ تھی۔ آپ نے اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی بلکہ حدیث کے لفظ صاف ہیں کہ اس کی تسلی کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ہاتھ رکھنا چاہا۔ کیا زبردستی ہاتھ ڈالنے سے دوسرے انسان کی تسلی ہوا کرتی ہے؟ اس حدیث سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا ہے کہ اس کو معلوم

نہ تھا کہ آپ کون ہیں کیونکہ اس حدیث میں اس قسم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح بیت المال سے اس کو کسی رقم کے دیئے جانے کا کوئی ذکر نہیں۔ ایک صحابی کو کہا گیا ہے کہ وہ اس کو دو کپڑے دے دے اور اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ بیت المال سے دیدے بلکہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی طرف سے کپڑے دینے کو کہا گیا ہے۔ خواہ یہ سمجھ لیا جائے کہ اس صحابی کے پاس آپ کا کچھ مال ہو گا خواہ یہ کہ اس سے آپ نے قرض لے کر یہ کپڑے دلوائے۔ تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ آپ بیت المال مسلمانان سے کوئی رقم اپنے ذاتی اخراجات کے لئے نہیں لیتے تھے پھر اس ثابت شدہ حقیقت کے خلاف کوئی نتیجہ کس طرح نکالا جا سکتا ہے؟

مصنف ہفوات کا بغض اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ اس حدیث کے اس حصہ کا ترجمہ جس میں جونیہ پر ہاتھ رکھنے کا ذکر ہے اس نے یوں کیا ہے۔ "پس آنحضرت نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا (یعنی زبردستی کرنی چاہی) تاکہ اسے تسکین ہو" صفحہ ۸۔ اس ترجمہ کو دیکھ کر ہی ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ مصنف ہفوات اس کتاب کی تصنیف کے وقت جوش تعصب سے اندھے ہو رہے تھے۔ کیونکہ ایک طرف تو آپ حدیث کے لفظوں کا یہ ترجمہ کرتے ہیں کہ ہاتھ بڑھایا تا اس عورت کو تسکین ہو۔ اور دوسری طرف خطوط وحدانی میں نوٹ کرتے ہیں "یعنی زبردستی کرنی چاہی" اور یہ جملہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ فلاں شخص کو اس نے مارنا چاہا تا اس کے دل سے ڈر نکل جائے۔ فلاں شخص کو اس نے زہر دیا تا وہ بچ جائے۔ اگر آپ نے اس عورت کی تسکین کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا تو اس سے زبردستی کرنے کا مفہوم کیونکر نکل آیا۔

غرض حدیث کے الفاظ اس مفہوم کو بہ صراحت ردّ کر رہے ہیں جو مصنف ہفوات نے حدیث سے اخذ کیا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ صراحت اس حدیث کے سیاق وسباق سے ہو جاتی ہے اور کم سے کم ائمہ حدیث ہر ایک اعتراض سے محفوظ ہو جاتے ہیں

اس حدیث کا جو مفہوم امام بخاری نے سمجھا ہے اور اس عورت کا جو تعلق انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خیال کیا ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ یہ حدیث انہوں نے اس مسئلہ کے ثبوت میں تحریر کی ہے کہ کیا طلاق دینی اور خصوصاً عورت کے منہ پر طلاق دینی درست ہے چنانچہ وہ اس حدیث کو اس باب میں بیان کرتے ہیں، بَابُ مَنْ طَلَّقَ وَ هَلْ يُوَاجِهُ الرَّجُلُ امْرَأَتَهٗ بِالطَّلَاقِ یہ عنوان ظاہر کرتا ہے کہ امام بخاری جونیہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منکوحہ بیوی خیال کرتے ہیں اور آپ کے اس قول کو کہ تُو نے اس کی پناہ مانگی ہے جو پناہ دینے والا

ہے طلاق قرار دے کر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ضرورت کے وقت طلاق عورت کے منہ پر بھی دی جا سکتی ہے اور یہ بداخلاقی نہیں کہلائے گی۔ اگر جونیہ امام بخاری کے نزدیک زن اجنبیہ تھی اور اگر اس کا انکار حفاظتِ عصمت کے لئے تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا واپس آجانا فضیحت کے خوف سے تھا (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِکَ) تو اس سے یہ کیونکر ثابت ہو گیا کہ عورت کو اس کے منہ پر طلاق ☆ دی جا سکتی ہے پس باوجود اس کے کہ امام بخاری اس حدیث سے یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ جونیہ آپ کی منکوحہ بیوی تھی اور اس کے گستاخی آمیز کلام کی وجہ سے آپ نے اس کو طلاق دے دی تھی یہ نتیجہ نکالنا کہ محدثین نے آپ پر اقدام زنا کی تہمت لگائی ہے کہاں تک درست ہے۔ کیا مصنّف ہفوات کے نزدیک ایک خاوند کا اپنی بیوی کے پاس جانا زنا ہے اور کیا اسی معیار پر وہ اپنی اور اپنے آباء کی نسل کو پرکھا کرتے ہیں۔

یہ تو اس حدیث کا سیاق ہے۔ سباق بھی اس سے کم واضح نہیں۔ اس حدیث کے بعد جو مصنّف ہفوات نے بیان کی ہے دوسری حدیث جو اسی راوی کی بیان کردہ ہے جس نے پہلی روایت بیان کی ہے یہ ہے۔ ' عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ وَاَبِیْ اُسَیْدٍ قَالَا تَزَوَّجَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

☆ ہفوات کے نئے ایڈیشن میں مولوی ثناء اللہ صاحب کے جواب کا ذکر کرتے ہوئے جو انہوں نے اس اعتراض کے متعلق اپنے اخبار میں شائع کیا ہے مصنّف صاحب ہفوات لکھتے ہیں کہ باب الطلاق کے نیچے اس حدیث کا درج کرنا اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ امام بخاری کی مراد یہ ہے کہ جونیہ کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہو چکا تھا کیونکہ امام بخاری باب و حدیث کی مطابقت کی پابندی نہیں کیا کرتے۔ اول تو ان کا یہ دعویٰ باطل ہے امام بخاری پابندی کرتے ہیں مگر انہوں نے کتاب سمجھداروں کے لئے لکھی ہے جُہّال کے لئے نہیں لکھی اس لئے بعض جہلاء کو جو حقیقت شناسی کی قابلیت نہیں رکھتے باب و حدیث میں موافقت نظر نہیں آتی۔ لیکن اگر یہ کوئی اعتراض ہے تو امام بخاری ہی اس کا نشانہ نہیں ہیں شیعوں کی سب سے معتبر کتاب "کافی" بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے چنانچہ فروع کافی جلد اول میں صلوٰۃ فاطمہ کا باب باندھ کر نیچے جو احادیث لکھی ہیں ان میں حضرت فاطمہ کی نماز کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ پس اس اصل کے ماتحت کہ اگر بعض بابوں کا احادیث سے جہلاء کو تعلق نظر نہ آئے تو اس کے یہ معنے ہیں کہ باب سے حدیث کے مفہوم کا استدلال درست نہیں تمام "کافی" غیر معتبر ٹھہرے گی۔

اُمَیْمَۃَ بِنْتَ شَرَاحِیْلَ فَلَمَّآ اُدْخِلَتْ عَلَیْہِ بَسَطَ یَدَہٗ اِلَیْھَا فَکَاَنَّھَا کَرِھَتْ ذٰلِکَ فَاَمَرَ اَبَااُسَیْدٍ اَنْ یُّجَھِّزَھَا وَ یَکْسُوْھَا ثَوْبَیْنِ رَازِقِیَّیْنِ۔ [۶۴] رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امیمہ بنت شراحیل سے نکاح کیا جب وہ آپ کے پاس لائی گئی اور آپ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے ایسا ظاہر کیا گویا وہ اس کو ناپسند کرتی ہے۔ پس آپ نے ابا اسید کو حکم دیا ہے کہ اسے واپس اس کے وطن پہنچاوے اور دو رازقی چادریں اس کو دے دے یہ حدیث جیسا کہ اوپر آچکا ہے انہی ابو اسید کی بیان کردہ ہے جنہوں نے پہلی حدیث بیان کی ہے اور یہی ہیں جن کو کپڑے دینے کا حکم ملا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ وہ عورت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منکوحہ تھی۔

اس سیاق و سباق کی موجودگی میں مصنف ہفوات کا جونیہ کو ایک اجنبی عورت قرار دے کر اور ایک سر تا پا جھوٹا قصہ بنا کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر گندے سے گندے اعتراضات کرنا خواہ وہ اعتراضات بظاہر ائمہ حدیث کا نام لے کر ہی کیوں نہ کئے جائیں۔ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ان کو اسلام اور بانی اسلام سے محبت نہیں بلکہ عداوت ہے اور یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر حقیقت کو چھپایا ہے نہ کہ نادانی سے واقعات کو نظر انداز کیا ہے۔

میرے نزدیک مصنف ہفوات کے اعتراض کی حقیقت پوری طرح تب بے نقاب ہوگی جب میں جونیہ کا تمام واقعہ تاریخ سے بیان کر دوں۔ طبری ابن سعد اور ابن حجر جیسے زبردست مؤرخین کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اسماء یا امیمہ اس کے نام میں اختلاف ہے (مگر میرے نزدیک ہو سکتا ہے کہ اس کے دو نام ہوں۔ ایسا بہت دفعہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کے دو نام ہوتے ہیں یا تو مختلف رشتہ دار مختلف نام رکھ دیتے ہیں یا بعض لوگ خود ہی بڑی عمر میں اپنے لئے ایک اور نام پسند کر لیتے ہیں اور لوگوں میں وہ ان مختلف ناموں کی وجہ سے مشہور ہو جاتے ہیں) کندہ قبیلہ سے تھی اور اس نسبت سے کندیہ کہلاتی تھی۔ اس کے والد کا نام اسود ابو الجون تھا۔ اس وجہ سے وہ جونیہ یا بنت الجون کہلاتی تھی۔ بعض روایات میں اس کو اسود کی پوتی اور نعمان کی بیٹی لکھا ہے۔ لیکن یہ اختلاف بے حقیقت اور اصل مطلب سے بے تعلق ہے۔ جب عرب فتح ہوا اور اسلام پھیلنے لگا تو اس کا بھائی نعمان یا بموجب بعض روایات کے اس کا والد نعمان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی قوم کی طرف سے بطور وفد کے حاضر ہوا اور اس موقع پر اس نے یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ اپنی ہمشیرہ کی شادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دے اور بالمشافہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست بھی کر دی کہ میری ہمشیرہ جو پہلے اپنے ایک رشتہ دار سے بیاہی

ہوئی تھی اور اب بیوہ ہے نہائت خوبصورت اور لائق ہے آپ اس سے شادی کر لیں۔ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قبائل عرب کا اتحاد منظور تھا آپ نے اس کی یہ درخواست منظور کرلی۔ فرمایا کہ ساڑھے بارہ اوقیہ چاندی پر نکاح پڑھ دیا جائے۔ اس نے کہا کہ یا رسول اللہ! ہم معزز لوگ ہیں مہر تھوڑا ہے۔ آپ نے فرمایا اس سے زیادہ میں نے کسی اپنی بیوی یا لڑکی کا مہر نہیں باندھا۔ جب اس نے رضامندی کا اظہار کیا نکاح پڑھا گیا اور اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ کسی آدمی کو بھیج کر اپنی بیوی منگوا لیجئے۔ آپ نے ابا اسید کو اس کام پر مقرر کیا وہ تشریف لے گئے۔ جونیہ نے ان کو اپنے گھر میں بلایا تو آپ نے کہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں پر حجاب نازل ہو چکا ہے۔ اس نے اس پر دوسری ضروری ہدایات دریافت کیں۔ آپ نے بتا دیں اور اونٹ پر بٹھا کر مدینہ لائے اور ایک مکان میں جس کے گرد کھجوروں کے درخت بھی تھے لا کر اتارا۔ اس کے ساتھ اس کی دایہ بھی اس کے رشتہ داروں نے روانہ کی تھی جس طرح کہ ہمارے ملک میں ایک بے تکلف نوکر ساتھ کی جاتی ہے تا کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ چونکہ یہ عورت حسین مشہور تھی اور یوں بھی عورتوں کو دلہن کے دیکھنے کا شوق تھا مدینہ کی عورتیں اس کو دیکھنے گئیں اور اس عورت کے اپنے بیان کے مطابق کسی عورت نے اس کو سکھا دیا کہ رعب پہلے دن ہی ڈالا جاتا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تیرے پاس آئیں تو تو کہہ دیجئیو کہ میں آپ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔ اس پر وہ تیرے زیادہ گرویدہ ہو جائیں گے۔ اگر یہ بات اس عورت کی بنائی ہوئی نہیں تو کچھ تعجب نہیں کہ کسی منافق نے اپنی بیوی یا اور کسی رشتہ دار کے ذریعہ یہ شرارت کی ہو۔ غرض جب اس کی آمد کی اطلاع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی آپ اس گھر کو تشریف لے گئے جو اس کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ اور اس کو اپنے پاس بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس نے اس پر کراہت کا اظہار کیا۔ آپ نے اس خیال سے کہ یہ اجنبیت کی وجہ سے گھبرا رہی ہے تسکین اور تسلی دینے کے لئے اس پر ہاتھ رکھا جس پر اس نے وہ نامعقول فقرہ کہا کہ میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔ چونکہ نبی خدا کا نام سن کر ادب کی روح سے بھر جاتا ہے اور اس کی عظمت کا متوالا ہوتا ہے اس کے اس فقرہ پر آپ نے اسے کہہ دیا کہ تُو نے بڑے کا واسطہ دیا ہے میں تیری درخواست کو قبول کرتا ہوں اور اسے طلاق دے کر رخصت کر دیا اور ابو اسید کو پھر اس کام پر مقرر کر دیا کہ اسے اس کے گھر واپس کر آئیں۔ اور علاوہ مہر کے حصہ کے دو ازرقی چادریں بھی اس کو دینے کا حکم دیا تا کہ قرآن کریم کا حکم وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ [۱۵] پورا ہو جو ایسی عورتوں کے متعلق ہے جن کو

بلا صحبت طلاق دے دی جائے۔ جب آپ نے اس کو رخصت کر دیا تو ابو اُسید اس کو اس کے گھر پہنچا آئے۔ اس کے قبیلہ کے لوگوں پر یہ بات نہایت شاق گزری اور انہوں نے اس کو ملامت کی مگر وہ یہی جواب دیتی رہی کہ یہ میری بدبختی ہے اور بعض دفعہ اس نے یہ کہہ دیا کہ مجھے دھوکا دیا گیا مجھے کسی نے سکھا دیا تھا کہ تُو اس طرح کہیو اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دل تیری طرف خاص طور سے مائل ہو جائے گا۔

یہ ہے اصل واقعہ جو تاریخوں اور احادیث میں مفصّل موجود ہے۔ اس موجودگی میں مصنّف ہفوات کا احادیث بخاری پر یہ اعتراض کرنا کہ ان میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر زنا کی تہمت لگائی گئی ہے۔ اور اس اعتراض کو زور دار بنانے کے لئے ایک آریہ صاحب کو بھی اپنی مدد کے لئے لانا مصنّف ہفوات کے جن اندرونی جذبات پر دلالت کرتا ہے ان کا اندازہ لگانا میں حق پسند لوگوں پر ہی چھوڑتا ہوں۔

مذکورہ بالا حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ جو واقعہ احادیث میں مذکور ہے اس کی بناء پر نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر کسی قسم کا اعتراض کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے بیان کرنے پر محدثین پر کوئی حرف گیری کی جا سکتی ہے۔ بلکہ اس واقعہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی مندرجہ ذیل خوبیاں نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔

(۱) اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو عربوں کی اصلاح کی خاطر ان کے جذبات کے خیال رکھنے کا خاص طور پر احساس تھا۔

(۲) اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اخلاق ایسے اعلیٰ درجہ کے تھے کہ آپ اپنی بیویوں سے بھی جو تمام قوانین تمدن کے ماتحت خاوند کے زیر حکومت سمجھی جاتی ہیں ایسے رنگ میں کلام کرتے تھے جو نہایت مؤدب ہوتا تھا اور جسے سن کر انسان خیال کر سکتا ہے کہ گویا کسی نہایت قابل ادب وجود سے آپ کلام کر رہے تھے۔

(۳) اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو نکاح میں عورت کی رضامندی کا اس قدر خیال تھا کہ نکاح کے بعد اس خیال سے کہ شاید عورت کی رضامندی حاصل نہ کی گئی ہو آپ نے جونیہ سے کہا کہ ھَبِیْ نَفْسَکِ لِیْ اپنا آپ مجھے سونپ دے یعنی نکاح پر رضا ظاہر کر۔

(۴) اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نہایت اشتعال انگیز باتوں پر بھی خندہ پیشانی سے صبر کر جاتے تھے۔

(۵) اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خشیت اللہ آپ کے دل میں اس قدر تھی کہ خدا تعالیٰ کا نام آنے پر آپ حتی المقدور اپنے حقوق کے چھوڑ دینے پر بھی تیار ہو جاتے تھے۔

(٦) اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان لوگوں سے بھی حسن سلوک کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے جو آپ کے لئے ایذاء اور تکلیف کا موجب بنتے تھے۔

غرض بجائے اس کے کہ اس واقعہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ اعتراض بھی پڑتا ہو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اخلاقِ حَسنہ کا ایک بے نظیر نمونہ تھے پیشتر اس کے کہ میں اس اعتراض کا جواب ختم کروں میں ان استدلالات پر بھی روشنی ڈالنا پسند کرتا ہوں جو میرے اوپر کے بیان کے خلاف بخاری کی نقل کردہ احادیث سے دشمن کر سکتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ حدیث میں جو یہ لفظ ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک عورت کا ذکر کیا گیا اور آپ نے اس کو بلوایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا اس سے نکاح نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ اعتراض درست نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اس عورت کے متعلق جب کہ تاریخ اور حدیث سے ثابت ہے کہ اس کے باپ یا بھائی نے خود اس کا ذکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کیا ہے اور نکاح کی درخواست کی ہے اور مہر مقرر کیا ہے اور نکاح پڑھا گیا ہے بلکہ اس عورت کے واقع سے فقہاء یہ استدلال کرتے چلے آئے ہیں کہ عورت کے منہ پر اسے ضرورتاً طلاق دینی جائز ہے۔ تو پھر ان الفاظ سے یہ کیونکر نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس کا نکاح نہیں ہوا تھا۔ اس حدیث سے تو صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ چونکہ اس جگہ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹورے کا (اصل حدیث اس بارے میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹورے میں ایک صحابی نے ایک اپنے دوست کو پانی پلایا ہے) ذکر کرنا مقصود تھا نکاح کے ذکر کو مختصر کر دیا ہے۔ چنانچہ طلاق کے ذکر میں یہی راوی اس واقعہ کا بیان کرتے ہوئے بیان کرتا ہے۔ تَزَوَّجَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُمَیْمَۃَ بِنْتَ شَرَاحِیْلَ یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جونیہ عورت سے نکاح کیا تھا۔

دوسرا استدلال یہ کیا جا سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ لفظ استعمال فرمائے ہیں کہ اپنا نفس مجھے دے۔ تو ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح نہیں ہوا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ الفاظ اس امر پر دلالت نہیں کرتے کہ نکاح نہیں ہوا تھا بلکہ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قومی شرف کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اخلاق فاضلہ سے

کام لیتے ہوئے یہ الفاظ اسے پاس بلانے کے لئے استعمال فرمائے ہیں اور اس قسم کے الفاظ میں جیسے ایک میزبان دسترخوان پر سے کسی چیز کے اٹھا کر دینے کے لئے مہمان سے کہہ دے کہ فلاں چیز مجھے عنایت فرمائیے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہوں گے کہ وہ مہمان کی تھی اور اس سے میزبان سوال کرتا ہے۔ غرض اپنا آپ مجھے عطا کر' کے صرف یہ معنے ہیں کہ میرے قریب ہو کر بیٹھ نہ کہ درخواست نکاح۔

دوسرا جواب اس اعتراض کا یہ ہے کہ چونکہ جس وقت نکاح ہوا ہے اس وقت یہ عورت مدینہ میں موجود نہ تھی اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال سے کہ عورت کی رضامندی حاصل کرنا نکاح کے لئے نہایت ضروری ہے ایسا نہ ہو کہ بھائی نے اپنی عزت کے خیال سے بِلا اجازت ہی نکاح پڑھوا دیا ہو اور یونہی کہہ دیا ہو کہ بہن راضی ہے۔ اس سے کہا کہ هَبِیْ نَفْسَکِ لِیْ یعنی اب اپنی مرضی کا اظہار کردے کہ تُو میرے نکاح میں خوشی سے آئی ہے۔ اس نے اس پر چونکہ ناراضگی کا اظہار کیا آپ نے اس کو اس کے گھر بھجوا دیا قرآن کریم میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکاح کرنے والی عورتوں کے متعلق لفظ ہبہ استعمال ہوا ہے جیسا کہ سورۃ احزاب میں ہے اِمْرَاَۃً مُّؤْمِنَۃً اِنْ وَّھَبَتْ نَفْسَھَا لِلنَّبِیِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْکِحَھَا [۲۶] یعنی وہ عورت بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جائز ہے جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نکاح میں لانا چاہیں اور وہ اپنے نفس کو اس امر کے لئے پیش کردے۔

مصنّف ہفوات کی نقل کردہ احادیث سے یہ بھی استدلال کیا جا سکتا ہے کہ اس عورت کا یہ کہنا کہ میں تم سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں بتاتا ہے کہ اس کا نکاح نہیں ہوا تھا۔ یہ استدلال بھی غلط ہو گا۔ اس لئے کہ اس عورت نے جیسا کہ خود ظاہر کیا ہے۔ یہ الفاظ اپنا رُعب جمانے کے لئے کہے تھے اور اس نے خیال کیا تھا کہ اس طرح آپ کے دل میں میری محبت بڑھ جائے گی۔ پس ان سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا نکاح آپ سے نہیں ہوا تھا یا یہ کہ اسے معلوم نہ تھا ابواسید اس کو لائے۔ راستے میں وہ ان سے وہ طریق پوچھتی رہی جس کا اختیار کرنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے لئے ضروری تھا۔ پھر کیونکہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ناواقف تھی۔ پس اس فقرہ کا محرک صرف یہ خیال تھا کہ اس قسم کی بات کہنے سے اس کا درجہ بڑھ جائے گا۔

ایک یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ اگر واقعہ میں اس کا نکاح ہو چکا تھا تو پھر اس نے یہ کیوں کہا کہ میں ان کو نہیں جانتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ طبعی جواب ہے جو ایسے موقعوں پر دیا جاتا ہے

اور علی الخصوص عورتیں دیا کرتی ہیں۔ لوگوں کا یہ سوال کرنا کہ تُو جانتی ہے کہ یہ کون تھا؟ یہ بھی اظہار غصہ کے لئے تھا جیسا کہ ناراضگی میں ایسا فقرہ کہا جاتا ہے کہ تجھے معلوم ہے میں کون ہوں؟ یا تجھے معلوم ہے یہ کون ہے؟ اور اس عورت کا جواب بھی غصہ اور نامرادی کے نتیجہ میں تھا کہ میں نہیں جانتی کہ یہ کون ہے یعنی میں نہیں پرواہ کرتی کہ یہ کون تھا چنانچہ حقارت کے لئے لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ فلاں شخص کون ہے حالانکہ بچپن سے اس شخص کے ساتھ تعلق اور واقفیت ہوتی ہے۔

غرض یہ سب استدلال باطل ہیں۔ اور واقعات کے مقابل میں قیاسات کو رکھنا عقل و دانش کے بالکل برخلاف ہے۔ جب کہ اسی روایت کا راوی صاف الفاظ میں یہ بیان کرتا ہے کہ اس عورت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی ہوئی تھی اور جب کہ ابو اسید جو اس عورت کو لائے ہیں وہ بیان کرتے ہیں کہ اس عورت کی شادی ہو چکی تھی۔ اور جب کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اس کی شادی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو چکی تھی اور آپ نے اس کو طلاق دے دی۔ تو پھر بعض اشارات سے جن کے کئی معنے ہو سکتے ہیں یہ نتیجہ نکالنا کہ شادی نہیں ہوئی تھی اور واقعات اور تفصیلات کو ترک کر دینا کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟ اسی طرح جب کہ امام بخاری نے اس روایت کے نتیجہ میں یہ نکالا ہے کہ عورت کو اس کے منہ پر طلاق دے جا سکتی ہے۔ اور جب کہ انہوں نے اسی روایت سے پہلے اس عورت کے متعلق حضرت عائشہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ اس عورت کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد نکاح طلاق دی تھی۔ اور جب کہ انہوں نے اس روایت کے بعد اسی راوی کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے کہ اس عورت کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کرنے کے بعد بلوایا تھا۔ یہ نتیجہ نکالنا کہ امام بخاری کا اس روایت کے نقل کرنے سے یہ منشاء تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اقدام زنا کا الزام لگایا جائے کیسا صریح جھوٹ اور کھلا کھلا دھوکا ہے۔

میں نے اوپر بیان کیا تھا کہ یہ دونوں روایتیں جو مصنّف ہفوات نے بیان کی ہیں درحقیقت ایک ہی واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ میرے نزدیک اس امر کا ثابت کرنا بھی مصنّف ہفوات کی اصل نیت پر سے پردہ اٹھا دیتا ہے اس لئے میں اس کو ثابت کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔

علاوہ اس کے کہ تمام دوسری روایات اس امر کو ثابت کرتی ہیں کہ یہ دونوں حدیثیں ایک ہی واقعہ کے متعلق ہیں۔ ان دونوں میں مندرجہ ذیل باتوں کا اشتراک بھی اس امر کو روز روشن کی

طرح ثابت کر دیتا ہے۔

اول۔ دونوں روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورت باہر سے لائی گئی تھی۔

دوم۔ دونوں روایتوں میں ایک ہی مکان کا ذکر ہے جس میں وہ عورت اتاری گئی

سوم۔ دونوں روایتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ ابو اسید کو اس عورت کو لانے اور لے جانے کا کام سپرد ہوا۔

چہارم۔ دونوں روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس عورت کے پاس تشریف لے گئے اور اس سے تسکین دہ الفاظ میں کلام کیا۔ لیکن اس نے کہا کہ میں آپ سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں۔

پنجم۔ دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس کے اس قول پر اسے علیحدہ کر دیا۔

کیا کوئی عقل تجویز کر سکتی ہے کہ یہ سب واقعات ایک ہی شخص سے دو دفعہ گزرے تھے اور کیا صرف اس وجہ سے کہ ایک حدیث میں اس عورت کا نام نہیں آیا ان دونوں روایتوں کو دو واقعوں کے متعلق قرار دیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں تمام معتبر شرّاح اور مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ دونوں حدیثیں ایک ہی امر کے متعلق ہیں۔ دیکھو قسطلانی و فتح الباری۔

مگر میں سمجھتا ہوں کہ مصنّف صاحب ہفوات کی تسلی نہ ہو گی جب تک شیعہ کتب سے ہی یہ ثابت نہ کیا جائے کہ جونیہ بیاہتا بیوی تھیں اور اس غرض کے لئے میں مصنّف صاحب ہفوات کو شیعوں کی سب سے معتبر کتاب فروع کافی جلد دوم کا حوالہ دیتا ہوں اس کتاب کے صفحہ ۱۷۶ پر کِتَابُ النِّکَاح میں باب اٰخِرُ مِّنْہُ لکھ کر حسن بصری سے روایت کی ہے کہ جونیہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کیا تھا[67] اور پھر امام ابو جعفر سے اس کی تصدیق نقل کی ہے بلکہ ان کی زبان سے یہ اعتراض کرایا ہے کہ اس کو اور ایک اور عورت کو حضرت ابو بکر نے نکاح کی اجازت دے دی حالانکہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آجانے کی وجہ سے امہات المؤمنین میں شامل تھی۔ اب کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایک طرف تو جونیہ کو نکاح کی اجازت دینے پر حضرت ابو بکر پر یہ اعتراض کیا جائے کہ آپ نے ایک ام المؤمنین کو نکاح کی اجازت دے کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتک کی اور دوسری طرف یہ کہا جائے کہ بخاری نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات جونیہ سے بیان کر کے آپ پر اقدام زنا کا الزام لگایا ہے۔ اگر جونیہ بیاہتا بیوی نہ تھی تو بقول فروع کافی امام جعفر نے اسے نکاح ثانی کی اجازت دینے پر اعتراض کیوں کیا ہے اور اگر وہ بیاہتا تھی تو اس سے ملاقات کا ذکر اقدام زنا کا الزام کیونکر بن گیا۔ اب کیا امام جعفر کو

نَعُوْذُ بِاللّٰہِ الزام دیں کہ انہوں نے حضرت ابوبکر کو بدنام کرنے کے لئے ان پر ایک اتہام لگایا یا مصنّف ہفوات کو بے دین قرار دیں کہ بخاری کی عداوت میں اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت پر حملہ کیا۔

حلول خدا بہ صورت عائشہ

ایک اعتراض مصنّف ہفوات نے یہ کیا ہے کہ مصنّف کتاب فردوس آسیہ لکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں اُولٰٓئِکَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا یَقُوْلُوْنَ [۴۸] کے الفاظ آتے ہیں ان کے یہ معنی ہیں کہ صفوان اور عائشہ اور صدیق بری ہیں اس سے جو منافق کہتے ہیں اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ فردوس آسیہ کے مصنّف کے نزدیک حضرت عائشہؓ پر نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ کسی منافق نے حضرت ابوبکر کے ساتھ ناجائز تعلق کا بھی الزام لگایا تھا۔

تعجب ہے کہ مصنّف ہفوات نے دعویٰ تو یہ کیا تھا کہ احادیث میں جو ہتک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کی گئی ہے اس کو پیش کریں گے لیکن آگئے فردوس آسیہ پر اور وہ بھی اس کے اقوال اور خیالات پر جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل غرض ان کی صرف اعتراض کرنا اور اہل سنت سے لوگوں کو بدظن کرنا ہے نہ کہ احادیث کی تحقیق و تدقیق۔

چونکہ میرا کام ان احادیث اور ائمہ احادیث کے متعلق حقیقت کو ظاہر کرنا ہے جن پر مصنّف ہفوات نے اعتراض کئے ہیں اس لئے فردوس آسیہ کے مصنّف کے بریت کی کوشش کرنا میرے مقصد سے دور ہے۔ مگر ضمناً میں اس قدر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ گو میں نہیں جانتا کہ مصنّف فردوس آسیہ کس تقویٰ اور کس علم کا آدمی تھا۔ مگر اس کی مذکورہ بالا تحریر سے وہ نتیجہ نکالنا جو مصنّف ہفوات نے نکالا ہے درست نہیں۔

مصنّف ہفوات کو معلوم ہونا چاہئے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو اولاد کے افعال پر ماں باپ کے افعال کو قیاس کر لیا کرتے ہیں اور کسی بچہ کے بدفعل کو دیکھ کر کہہ دیا کرتے ہیں کہ اس کے ماں باپ بھی ایسے ہی ہوں گے۔ پس کیا تعجب ہے کہ بعض منافقوں نے جن کو حضرت ابوبکر سے بلا وجہ بغض تھا اور جو ان کو اسلام کے لئے بمنزلہ ستون دیکھ کر ان کی تباہی اور بربادی کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ یہ بھی کہہ دیا ہو کہ جیسی بیٹی ثابت ہوئی ہے (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ) ایسا ہی باپ ہوگا۔ یا کم سے کم مصنّف آسیہ کو یہ خیال پیدا ہوا ہو۔ پس اس صورت میں اس آیت میں حضرت ابوبکر کی بریت بھی خود بخود آگئی کیونکہ جب حضرت عائشہ پر سے اللہ تعالیٰ نے اعتراض دور

کر دیا تو حضرت ابو بکر پر سے خود ہی اعتراض دور ہو گیا۔

قرآن کریم میں بھی اسی قسم کے خیالات کے لوگوں کا ذکر ہے۔ چنانچہ حضرت مریم کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ان کے ہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو لوگوں نے ان سے مخاطب ہو کر کہا یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا۔ یٰاُخْتَ ھٰرُوْنَ مَا کَانَ اَبُوْکِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّ مَا کَانَتْ اُمُّکِ بَغِیًّا[۲۹] ترجمہ۔ اے مریم تُو نے ایک حیرت انگیز کام کیا ہے۔ اے ہارون کی بہن تیرا باپ تو برا آدمی نہ تھا اور نہ تیری ماں فاحشہ تھی۔ یعنی یہ کس طرح ہوا کہ ان نیکوں کی اولاد خراب ہو گئی ہو۔ خراب اور بد کار تو بدوں کی اولاد ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو بھی وہ جواب سکھایا کہ ان کا منہ بند ہو گیا یعنی انہوں نے اس اعتراض کے جواب میں صرف اتنا کیا کہ فَاَشَارَتْ اِلَیْہِ[۳۰] حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف اشارہ کر دیا۔ یعنی ان کو انہی کے معیار سے ملزم کیا۔ ان کا تو یہ اعتراض تھا کہ بد کی اولاد بد ہوتی ہے اور نیک کی نیک۔ حضرت مریم علیہا السلام نے حضرت مسیح کی زندگی کو پیش کر دیا کہ اگر یہ معیار درست ہے تو دیکھو یہ میرا لڑکا کیسا ہے؟ اگر تمہارا خیال درست ہے تو پھر بدکاری کے نتیجہ میں یہ نیک اور نمونہ پکڑنے کے قابل لڑکا کہاں سے پیدا ہوا؟ تمہارے اصل کے مطابق تو خود اس لڑکے کا چال چلن ہی میری بریت کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ ان کے اس دعویٰ کی تصدیق میں اللہ تعالیٰ حضرت مسیح کا یہ دعویٰ پیش کرتا ہے۔ قَالَ اِنِّیْ عَبْدُاللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَادُمْتُ حَیًّا وَّبَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا۔ ذٰلِکَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ[۳۱] ترجمہ: مسیح نے اس پر کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے اور مجھے مبارک کیا ہے۔ جہاں بھی میں رہوں اور مجھے تاکید کی ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں عبادت اور زکوٰۃ کی ادائیگی پر کاربند رہوں۔ اور مجھے اس نے اپنی ماں سے بہت ہی نیک سلوک کرنے والا بنایا ہے (یعنی اگر میری ماں بدکار ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس سے نیک سلوک کرنے کا خاص حکم کیوں دیتا؟ اور اس کی مرضی کا پاس کیوں رکھتا؟) اور مجھے لوگوں کے حقوق چھیننے والا اور نیکی سے محروم رہنے والا نہیں بنایا۔ اور اس نے میرے تینوں زمانوں پر سلامتی نازل کی ہے جب میں پید ہوا اس وقت بھی اور جب میں مروں گا اور جب دوبارہ اٹھوں گا اس وقت بھی ایسا ہی ہو گا۔ مریم کا بیٹا عیسیٰ ایسا تھا یعنی ایسے آدمی کی والدہ پر وہ لوگ اعتراض کر سکتے تھے کہ وہ بدکار تھی۔ اور پھر مذکورہ بالا حالات کی

موجودگی میں۔

مصنّف ہفوات بجائے اس گندے اعتراض کے جو انہوں نے اپنی جبلی کمزوری کے ماتحت اختیار کیا ہے اگر قرآن کریم پر غور کرتے اور انسانوں کے مختلف طبقات کو دیکھتے تو مصنّف فردوس آسیہ کے قول کے وہ معنی بھی کر سکتے تھے جو اوپر بیان ہوئے ہیں اور جن پر کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا۔

اسی اعتراض کے تحت میں مصنّف ہفوات نے ایک اور اعتراض بھی کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مصنّف آسیہ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا جمال عائشہ کی شکل میں دکھلایا اور پھر درمیان سے پردہ اٹھا دیا اس پر مصنّف ہفوت کو اعتراض ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے نَعُوْذُ بِاللّٰہِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عورتوں کو محبت دیکھ کر عائشہ کی شکل میں حلول کیا۔

اس اعتراض کی بناء بھی کسی حدیث پر نہیں ہے۔ مصنّف ہفوات کو چاہئے تھا کہ اول وہ حدیث لکھتے جس میں یہ بات بیان ہے پھر اعتراض کرتے اور اگر ایسی کوئی حدیث ان کو معلوم نہ تھی یا اگر کوئی تھی تو ایسی تھی کہ اس کو پیش کرتے ہوئے ان کو اپنی انصاف پسندی پر سے پردہ اٹھنے کا احتمال تھا تو خاموش رہتے۔ اگر ایسی ہی باتوں پر اعتراض کیا جائے تو شیعہ صاحبان میں بھی ایسی روایات مشہور ہیں کہ جن کو سن کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ ایک روایت مشہور ہے کہ معراج کے دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرش پر حضرت علی کی ہی تصویر کو دیکھا تھا۔ پس اس قسم کی روایات اگر عوام الناس میں پھیل جائیں تو ان کی وجہ سے کسی مذہب یا اس کے ائمہ پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔

یہ جواب تو اس بات کو مدنظر رکھ کر ہے کہ ایسی کوئی صحیح حدیث اہل سنت میں نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کی شکل میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ لیکن اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا کیونکہ یہ ایک عام نظارہ ہے جس سے تمام روحانیت رکھنے والے مومن آگاہ ہیں اور اس پر اعتراض کر کے مصنّف ہفوات نے صرف اس امر کو ظاہر کیا ہے کہ ان کو روحانیت سے ذرہ بھی مس نہیں۔

یہ امر لاکھوں مومنوں کے تجربہ سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ عام کشف اور رؤیا میں انسانوں کی شکل میں نظر آجاتا ہے اور اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ محدود ہے یا حلول کرتا ہے بلکہ اس رؤیا سے صرف اس تعلق کا اظہار مراد ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو بندے سے ہے اور تصویری زبان میں

اس تعلق کو ظاہر کر کے ایک گہرا نقش اس کے دل میں جمایا جاتا ہے۔

میں نے خود کئی دفعہ اللہ تعالیٰ کو انسانی شکل میں دیکھا ہے اور مضمون رؤیا کے مطابق اس کی شکل مختلف طور پر دیکھی ہے۔ میں ہرگز نہیں سمجھتا کہ وہ شکل خدا تھی یا اس میں خدا تعالیٰ حلول کر آیا تھا۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک جلوہ تھی اور اس رؤیا کے مضمون کے مطابق الٰہی صفات کی جلوہ گری پر دلالت کر رہی تھی وہ ایک رؤیت تھی مگر تصویری زبان میں۔ اور اس تعلق کو ظاہر کرتی تھی جو اللہ تعالیٰ کو مجھ سے یا ان لوگوں سے تھا جن کے متعلق وہ رؤیا تھی حضرت استاذی المکرم مولوی نورالدین صاحب خلیفہ اول اپنی طالب علمی کے زمانہ کا ایک واقعہ سناتے تھے کہ ایک دفعہ آپ کے استاذ مولوی عبدالقیوم صاحب بھوپالوی نے جو مجدّد عصر حضرت سید احمد صاحب بریلوی کے خلفاء میں سے تھے خواب دیکھا کہ ایک شخص کوڑھی اندھا اور دیگر ہر قسم کی بیماریوں میں مبتلا بھوپال کے باہر پُل پر پڑا ہے اس سے آپ نے پوچھا کہ تُو کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں اللہ میاں ہوں۔ انہوں نے کہا اللہ میاں تو سب حُسنوں کا جامع ہے اور تُو سب عیبوں سے پُر ہے تو اس نے کہا کہ وہ بھی درست ہے لیکن میں بھوپال کے لوگوں کا خدا ہوں یعنی انہوں نے مجھے ایسا سمجھ چھوڑا ہے۔

غرض خدا تعالیٰ کی رُویت کئی بناء پر کی صورتوں میں مومن کو ہوتی ہے اور اس کے ایمان کی زیادتی کا موجب بنتی ہے اور اس پر اعتراض کرنا ایک جاہل اور نادان انسان کا کام ہوتا ہے واقف حقیقت اس گڑھے میں نہیں گرتا۔ پس اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ کی شکل میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت ہوئی ہو تو اس میں کچھ تعجب کی بات نہیں اور یہ اعتراض کا مقام نہیں اکثر دفعہ رؤیا کی تعبیر ناموں کے معنوں پر ہوتی ہے۔ اگر ایسی رؤیا کسی کو ہو تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ایک سلسلہ بخشے گا جو ہمیشہ قائم رہے گا کیونکہ عائشہ کے معنے زندہ رہنے والی کے ہیں اور اس نام کی عورت کی شکل میں اگر اللہ تعالیٰ اپنا جلوہ ظاہر کرے تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ یہ جلوہ نہ مٹنے والا ہے اور عورت اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ جلوہ امت کے متعلق ہے جو مؤنث ہے۔ ایسی رؤیا پر اعتراض کرنا کو رباطنی اور روحانیت سے حرمان پر دلالت کرتا ہے۔

نجات رسول از سکرات بلُعاب عائشہ

ایک اعتراض مصنّف ہفوات نے یہ کیا ہے کہ فردوس آسیہ میں لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے وفات کے وقت مسواک چبوائی تا کہ آپ پر

سکرات موت کی آسانی ہو۔ اور اس پر اعتراض کیا ہے کہ یہ کونسی طب کا نسخہ ہے کہ مسواک کسی کے منہ میں چبوا کرلی جائے تو اس سے سکرات موت میں آسانی ہوتی ہے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ فردوس آسیہ نہ حدیث کی کتاب ہے اور نہ اس پر اہل سنت والجماعت کے مذہب کا انحصار ہے پس اس کے حوالہ سے کوئی حدیث پیش کرنا درست ہی نہیں ہو سکتا جب کتب احادیث موجود ہیں تو ان کا حوالہ دینا مصنّف ہفوات کے لئے کیا مشکل تھا صاف ظاہر ہے کہ مصنّف ہفوات کو اس میں اپنے ارادہ کی قلعی کھل جانے کا احتمال تھا اور وہ جانتے تھے کہ اصل حوالہ جات کے ظاہر ہوتے ہی بہت سی روایات کی حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔

چونکہ یہ واقعہ بخاری میں بھی آتا ہے اس لئے میں بخاری کی روایت اس جگہ نقل کر دیتا ہوں۔ اس سے مصنّف ہفوات کے اعتراض کی حقیقت خود بخود ظاہر ہو جائے گی امام بخاری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ذکر میں حضرت عائشہ کی روایت لکھتے ہیں۔ کَانَتْ تَقُوْلُ اِنَّ مِنْ نِعَمِ اللّٰہِ عَلَیَّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تُوُفِّیَ فِیْ بَیْتِیْ وَفِیْ یَوْمِیْ وَبَیْنَ سَحْرِیْ وَنَحْرِیْ وَاَنَّ اللّٰہَ جَمَعَ بَیْنَ رِیْقِیْ وَرِیْقِہٖ عِنْدَ مَوْتِہٖ۔ دَخَلَ عَلَیَّ عَبْدُالرَّحْمٰنِ وَبِیَدِہٖ السِّوَاکُ وَاَنَا مُسْنِدَۃٌ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَرَاَیْتُہٗ یَنْظُرُ اِلَیْہِ وَعَرَفْتُ اَنَّہٗ یُحِبُّ السِّوَاکَ فَقُلْتُ اٰخُذُہٗ لَکَ فَاَشَارَ بِرَأْسِہٖ اَنْ نَعَمْ فَتَنَاوَلْتُہٗ فَاشْتَدَّ عَلَیْہِ فَقُلْتُ اُلَیِّنُہٗ لَکَ فَاَشَارَ بِرَأْسِہٖ اَنْ نَعَمْ فَلَیَّنْتُہٗ ۔ [۲]

ترجمہ۔ حضرت عائشہ فرمایا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو مجھ پر احسان کئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں اور میری باری میں فوت ہوئے ہیں اور میری گردن اور سینہ کے درمیان (یعنی اس مقام پر آپ نے ٹیک لگائی ہوئی تھی) اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اور آپ کے لعاب کو آپ کی وفات کے وقت جمع کر دیا۔ اور یہ اس طرح ہوا کہ عبدالرحمٰن (حضرت عائشہؓ کے بھائی) اندر آئے اور ان کے پاس مسواک تھی اور میں نے اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹیک دی ہوئی تھی میں نے دیکھا کہ آپ مسواک کی طرف دیکھ رہے ہیں اور میں نے سمجھا کہ آپ مسواک کرنا چاہتے ہیں پس میں نے آپ سے دریافت کیا کہ کیا آپ کے لئے یہ مسواک لے لوں؟ آپ نے سر سے اشارہ فرمایا کہ ہاں۔ میں نے مسواک لے کر آپ کو دی لیکن آپ کو وہ سخت معلوم ہوئی اس پر میں نے کہا کہ کیا میں اسے آپ کے لئے نرم کر دوں؟ آپ نے سر سے اشارہ فرمایا کہ ہاں۔ پس میں نے مسواک کو نرم کر دیا اور آپ نے

اپنے منہ میں مسواک کرنی شروع کر دی۔

دو طرح اور بھی بخاری میں روایت آتی ہے۔ لیکن مفہوم یہی ہے۔ اس امر کا کہیں بھی ذکر نہیں کہ عائشہ کی مسواک کرنے سے آپ پر سکرات موت کی سہولت ہو گئی جب کہ مصنّف ہفوات نے بخاری کو بہ نیت اعتراض پڑھا تھا تو ضرور اس روایت پر بھی ان کی نظر پڑی ہو گی۔ پھر اس کو چھوڑ کر فردوس آسیہ کی طرف توجہ کرنے کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اس حدیث پر اعتراض نہیں پڑ سکتا تھا بلکہ اگر وہ اس حدیث کو نقل کر دیتے تو اس سے اعتراض ہی رد ہو جاتا کیونکہ اس حدیث میں اس روایت کے بالکل خلاف مضمون ہے۔ فردوس آسیہ کی عبادت سے مصنّف ہفوات نے یہ مطلب نکالا ہے کہ گویا حضرت عائشہ کی برکت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سکرات میں کمی ہوئی حالانکہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ اس کو ایک فخر سمجھتی ہیں کہ مجھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری وقت میں خدمت کا موقع ملا۔ بخاری میں اسی موقع کے متعلق ایک اور روایت ہے اور وہ بھی حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ اس سے اس بہتان کی قباحت اور فضاحت اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ کتاب فضائل القرآن میں امام بخاری حضرت عائشہؓ سے باب المعوذات کے نیچے ایک روایت لکھتے ہیں جو یہ ہے عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا اشْتَكٰى يَقْرَأُ عَلٰى نَفْسِهٖ بِالْمُعَوِّذَاتِ وَيَنْفُثُ فَلَمَّا اشْتَدَّ وَجْعُهٗ كُنْتُ اَقْرَأُ عَلَيْهِ وَاَمْسَحُ بِيَدِهٖ رَجَاءَ بَرَكَتِهَا ترجمہ۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی بیماری ہوتی آپ اپنے جسم پر معوّذات پڑھ کر پھونک لیاکرتے۔ پس جب آپ کی بیماری بڑھ گئی تو میں ان سورتوں کو پڑھ کر آپ کا ہاتھ جسم پر پھیر دیتی اور آپ کا ہاتھ اس لئے پھیرتی تا برکت ہو۔

اس روایت سے ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ یا ائمہ حدیث کے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی یہ بات نہ تھی کہ حضرت عائشہؓ کو ایسی برکت حاصل تھی کہ ان کے لُعاب کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لعاب سے مل جانے سے آپ پر سکرات موت آسان ہو جائیں گے۔ اگر یہ بات ان کے ذہن میں ہوتی اور وہ بقول مصنّف ہفوات اس خیال کے پھیلانے کے خواہش مند ہوتے تو وہ مذکورہ بالا حدیث کو کیوں اپنی کتب میں درج کرتے۔

خلاصہ یہ کہ صحیح احادیث میں یہ بات کہیں بھی بیان نہیں ہے کہ حضرت عائشہؓ کو رسول کریم نے فرمایا کہ مجھے مسواک اس لئے چبا کر دے کہ مجھ پر سکرات موت آسان ہو جائے گی۔

جس بات کو مصنّف ہفوات نے چھپایا ہے میں اس کو ظاہر کر دیتا ہوں کہ عقیلی کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں اُمَضّغِیْہِ ثُمَّ اٰتِیْنِیْ بِہٖ اُمَضِّغُہٗ لِکَیْ یَخْتَلِطَ رِیْقِیْ بِرِیْقِکِ لِکَیْ یَھُوْنَ عَلَیَّ عِنْدَ الْمَوْتِ [32] اس کے معنے بے شک یہ کئے جاسکتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے مسواک چبا کر دے تا موت کے وقت کا حال مجھ پر آسان ہو۔ لیکن اس کے بھی یہ معنے نہیں نکل سکتے کہ لُعاب عائشہؓ میں کوئی ایسی برکت تھی بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ معنی نکلیں گے کہ آپ کو چونکہ عائشہ سے محبت تھی اور پیاروں کا قرب انسان کی تسلی کا موجب ہوتا ہے اس لئے جس طرح آپ کبھی اس جگہ منہ لگا کر پانی پی لیتے تھے جس جگہ منہ لگا کر عائشہؓ نے پیا ہو اسی طرح آپ نے اس وقت ایسی خواہش کی۔

مگر میرے نزدیک حق یہی ہے کہ یہ روایت باطل ہے۔ کیونکہ گو اس روایت سے قطعی طور پر وہی معنے نہیں نکلتے جو مصنّف ہفوات نے کئے ہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جو معنے بھی اس کے کئے جائیں وہ واقعات کے خلاف ہیں۔ بخاری کی روایت جو میں اوپر بیان کر آیا ہوں اور دوسری روایات جن کو میں نے بخوف طوالت نقل نہیں کیا یہ روایت ان کے خلاف ہے۔ اور اس لئے قابل اعتبار نہیں۔ بخاری اور دوسری معتبر کتب حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ایسے ضعیف ہو چکے تھے کہ اس قدر بھی گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ بخاری کی حدیث میں صاف لکھا ہے کہ حضرت عائشہ کے دریافت کرنے پر کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسواک لینا چاہتے ہیں؟ آپ نے منہ سے ہاں نہیں فرمایا بلکہ سر کا اشارہ فرمایا اور پھر جب آپ چبا نہیں سکے تو خود منہ سے نہیں فرمایا کہ اس کو چبا دو بلکہ حضرت عائشہؓ کے پوچھنے پر بھی سر سے فرمایا کہ ہاں چبا دو۔ پس جب کہ خود حضرت عائشہؓ کی روایت معتبر کتب احادیث میں یوں درج ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک چبانے کے لئے منہ سے کچھ نہیں کہا بلکہ صرف سر ہلایا۔ تو عقیلی کی روایت جس میں ایک فقرہ کا فقرہ درج ہے کس طرح درست ہو سکتی ہے؟ اور جب کہ وہ روایت اہل سنت کی معتبر کتب کی روایات کے خلاف ہے تو اسے ائمہ حدیث اور اہل سنت کے خلاف کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔

حضرت عائشہؓ کے ہاتھ دکھانے سے رسول کریمؐ کو سکرات موت سے نجات ہوئی؟

مصنف ہفوات نے فردوس آسیہ کے ہی حوالہ سے ایک اور اعتراض ائمہ حدیث پر کیا ہے اور وہ یہ کہ ان کی روایات کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سکرات موت سے نجات اس طرح ہوئی کہ آپ کو حضرت عائشہ کے ہاتھ اور ہتھیلیاں دکھائی گئی تھیں۔

اس روایت کو درج کر کے مصنف ہفوات نے یوں اعتراض کیا ہے

"غنیمت ہے کہ پیغمبر معصوم کو دوزخ نہ دکھائی ہاتھ ہتھیلیوں ہی پر خیر گزری، ورنہ ان خوش اعتقاد مولویوں سے یہ بھی دور نہ تھا"

پھر لکھا ہے۔

"لطیفہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ جناب عائشہؓ کے ہاتھوں کی قوت مقناطیسی بلکہ قوت برقی بڑھتے بڑھتے ملک الموت کا کام کرنے لگی تھی مَا شَآءَ اللّٰہُ"

جس شرافت، جس ادب، جس سنجیدگی کے ساتھ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہؓ کا ذکر کیا گیا ہے وہ مصنف ہفوات کے اندرونے کے ظاہر کرنے کے لئے خود ہی کافی ہے۔ اس پر مزید کچھ لکھنے کی مجھے ضرورت نہیں۔ میں اصل اعتراض ہی کے جواب پر کفایت کرتا ہوں۔ یہ حدیث جس کی طرف مصنف ہفوات نے اشارہ کیا ہے مسند احمد بن حنبل اور ابن سعد کی ہے۔ مسند احمد بن حنبل میں یہ الفاظ ہیں عَنْ عَائِشَۃَ اَیْضًا اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ قَالَ اِنَّہٗ لَیُھَوِّنُ عَلَیَّ الْمَوْتُ لِاَ نِّیْ رَأَیْتُ بَیَاضَ کَفِّ عَائِشَۃَ فِی الْجَنَّۃِ۔[۴] یعنی حضرت عائشہ نے یہ بھی روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ پر موت آسان ہو گئی ہے کیونکہ میں نے عائشہ کے ہاتھوں کی سفیدی کو جنت میں دیکھا ہے اور ابن سعد نے مرسل طور پر اس روایت کو یوں بیان کیا ہے اَنَّہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ قَالَ لَقَدْ رَأَیْتُھَا فِی الْجَنَّۃِ حَتّٰی لِیُھَوِّنَ عَلَیَّ بِذٰلِکَ مَوْتِیْ کَاَنِّیْ اَرٰی کَفَّیْھَا یَعْنِیْ عَائِشَۃَ[۵] ترجمہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جنت میں اس کو دیکھا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مجھ پر موت آسان ہو گئی ہے گویا کہ میں عائشہ کی ہتھیلیوں کو جنت میں دیکھ رہا ہوں۔

اصل روایات کو پڑھ لینے کے بعد کوئی عقلمند وہ اعتراض نہیں کر سکتا جو مصنف ہفوات نے کئے ہیں۔ ان روایات سے نہ اشارۃً نہ کنایۃً بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عائشہؓ کی ہتھیلیاں

دکھانے کے سبب سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح نکل گئی نہ یہ کہ ہتھیلیوں کے دیکھنے کے سبب سے آپ کے سکرات موت کم ہو گئیں یہ تمام کی تمام بات ایک سر تاپا جھوٹ ہے جس کے کہ مصنّف ہفوات اور ان کے ہم آہنگ لوگ خاص طور پر مشتاق معلوم ہوتے ہیں۔

اس حدیث کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ عائشہ کو جنت میں دیکھ کر آپ پر موت آسان ہو گئی ہے اور اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہر انسان خواہ نبی ہو خواہ غیر نبی بلکہ نبی زیادہ اس امر کی فکر رکھتا ہے کہ اس کے عزیز اور رشتہ دار بھی خدا کے غضب سے بچ جائیں اور اس کے فضلوں کے وارث ہوں۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ کا جنت میں دکھایا جانا واقع میں ایک خوشی کا امر تھا اور اس پر آپ کا یہ فرما دینا کہ مجھ پر یہ بات دیکھ کر موت آسان ہو گئی ہے۔ آپ کی شان کو بڑھانے والا ہے نہ کہ آپ کی شان کے خلاف۔ جس نبی کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ [6] کیا تُو اپنی جان کو ہلاک کر دے گا اس غم میں کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ کیا اس کو اپنے اہل کی نسبت اس امر کی خواہش نہیں ہو گی کہ وہ بھی انعامات الٰہیہ کے وارث ہوں اور کیا اگر اللہ تعالیٰ اس کے بعض اہل کی نسبت اس امر کی خوشخبری دے کہ وہ بھی اعلیٰ درجہ کے انعامات کے وارث ہوں گے۔ اور ان کے جسم خاص طور پر روشن بنائے جائیں گے تو اس کی آخری گھڑیاں خوشی سے معمور نہ ہوں گی؟ اے کاش! مصنّف صاحب ہفوات اپنے پتھر سے زیادہ سخت دل اور معکوس کوزے سے زیادہ ایمان سے خالی قلب سے اس واقعہ کو نہ جانچتے بلکہ ایک مومن دل کی حالت سے اندازہ لگاتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف نہیں ہے بلکہ آپ کی شان کو بڑھانے والی ہے اور اسی طرح حضرت عائشہؓ کی عظمت کا اظہار کرنے والی ہے۔ اور غالباً یہی باعث ہے کہ مصنّف ہفوات کو یہ حدیث گراں گزری ہے اور ان کو اپنے دماغ پر پورا زور دے کر عجیب قسم کے بے تعلق اعتراض ایجاد کرنے پڑے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس روایت میں سکرات موت کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ یہ واقعہ موت سے کسی قدر پہلے کا معلوم ہوتا ہے اور موت کے آسان ہونے کے معنے دل کی خوشی کی ہیں نہ کہ موت کی ظاہری تکلیف کے۔ کیونکہ اس قسم کی تکلیف ایک طبعی امر ہے اور دل کی خوشی یا عدم خوشی کا اس سے کچھ تعلق نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بداخلاقی کا الزام

فردوس آسیہ ہی کے حوالہ سے کَشْفُ الْغُمَّۃِ عَنْ جَمِیْعِ الْاَئِمَّۃِ کی ایک روایت درج کر کے مصنف ہفوات نے ایک اعتراض ائمہ حدیث پر یہ کیا ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بے شرمی کا الزام لگایا ہے۔ وہ روایت بقول مصنف ہفوات یہ ہے کہ

"جب آنحضرت میرے (عائشہ کے) گھر تشریف لاتے تو دونوں گھُٹنے میرے دونوں زانوں پر رکھتے اور دونوں ہاتھ مونڈھوں پر اور مجھ پر اوندھے ہو جاتے اور سانس چڑھ جاتی تھی"

میں پہلے لکھ آیا ہوں کہ فردوس آسیہ کوئی حدیث کی کتاب نہیں ہے اور نہ اس کی روایات اہل سنت کی مسلّمہ ہیں بلکہ ہم اس کے مصنف کی حالت تقویٰ اور علم کو بھی نہیں جانتے۔ پس اس کی روایات پر بناء رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ شیعہ مذہب پر اعتراض کرنے کے لئے کوئی شخص حشاشین اور بھنگی، چرسی، فقیروں کے اقوال پر اپنے دلائل کی بناء رکھے کیونکہ اس قسم کی کتاب کے مصنفین کی اصل غرض عجیب وغریب روایات کا جمع کرنا ہوتی ہے نہ کہ تحقیق وتدقیق۔

اسی طرح فردوس آسیہ نے جس کتاب سے یہ روایت نقل کی ہے وہ کتاب بھی حدیث کے علم کے لئے مستند نہیں ہے۔ امام شعرانی ان علماء میں سے ہیں جو روایت کی تحقیق سے زیادہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہم کسی روایت سے عبرت کیا حاصل کرسکتے ہیں پس خواہ روایت جھوٹی ہو خواہ سچی وہ اس کو درج کر دیتے ہیں۔ انہوں نے صوفیاء کرام کے سوانح میں جو کتاب لکھی ہے اس میں ایسی روایات بہت سی جمع کر دی ہیں جو گو شیعوں کی روایات کا تو مقابلہ نہیں کر سکتیں مگر پھر بھی عقل کو چکرا دینے کے لئے کافی ہیں اور ان کی غرض اس قسم کی روایات کو نقل کر دینے سے محض یہ ہوتی ہے کہ ہم ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں مگر محقق صوفیاء اور محقق ائمہ حدیث کا یہ طریق نہیں ہے وہ جب روایات کو جمع کریں گے تو بے شک ہر قسم کی حدیث جو اس خاص قانون کے مطابق ہو جسے انہوں نے اپنی تصنیف کے وقت مدنظر رکھا ہو درج کر دیں گے لیکن استعمال کے وقت اس امر کو مدنظر رکھیں گے کہ آیا کوئی حدیث تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے کس پایہ کی ہے۔

اس بات کو کھول دینے کے بعد کہ نہ فردوس آسیہ کا مصنف نہ امام شعرانی روایت کے معاملہ میں اس مقام پر ہیں کہ ان کی بیان کردہ روایت حدیث کی تحقیق کے متعلق کوئی وُقعت رکھتی ہو

میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے کشف الغمہ میں وہ روایت نہیں ملی جو مصنّف ہفوات نے درج کی ہے۔ ہاں ایک حدیث اس میں ایسی موجود ضرور ہے جس کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف ہفوات کا اسی کی طرف اشارہ ہے۔ مگر اس حدیث کے الفاظ اور ہیں اور مطلب اور۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ حدیث کس پایہ کی ہے کیونکہ کشف الغمہ کے مصنّف مستقل محدث نہیں ہیں اور انہوں نے حوالہ بھی نہیں دیا کہ معلوم ہوتا کہ انہوں نے اس حدیث کو کہاں سے نقل کیا ہے تا اس کی حقیقت معلوم کی جاتی۔ لیکن اس بات میں کچھ شک نہیں کہ کشف الغمہ کی روایت خواہ سچی ہو خواہ جھوٹی اس اعتراض کی حامل نہیں ہو سکتی جو مصنّف ہفوات نے کیا ہے مزید وضاحت کے لئے میں اس روایت کے الفاظ کشف الغمہ میں سے درج کر دیتا ہوں جو یہ ہیں۔ كَانَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلَ عَلَيَّ وَضَعَ رُكْبَتَيْهِ عَلٰى فَخِذِيْ وَيَدَيْهِ عَلٰى عَاتِقِيْ ثُمَّ أَكَبَّ فَأَحْنٰى عَلَيَّ [۲۲] یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب میرے گھر میں تشریف لاتے تو میری رانوں پر اپنے گھٹنے ٹیکتے اور میرے کاندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیتے پھر میری طرف جھکتے اور مجھ سے شفقت و پیار کا معاملہ کرتے۔ کشف الغمہ کی اصل روایت اور ہفوات المسلمین کی بیان کردہ عبارت میں یہ نمایاں فرق نظر آرہا ہے کہ اس میں سانس چڑھ جاتی تھی کے الفاظ بالکل موجود نہیں۔ اور اگر یہ روایت کسی اور جگہ بھی درج ہے اور اس میں یہ الفاظ موجود ہیں تو مصنّف ہفوات کا فرض ہے کہ اس کا حوالہ دے۔

اصل بات یہ ہے کہ ان الفاظ کو جدا کر کے اعتراض کی جان نکل جاتی ہے کیونکہ شہوت و بوالہوسی کی روح انہی الفاظ سے پیدا ہوتی ہے۔ پس اگر فردوس آسیہ میں یہ الفاظ موجود بھی ہیں تب بھی باوجود اس کے کہ عام طور پر یہ کتاب مل جاتی ہے کشف الغمہ سے حوالہ نہ دینے کی غرض ہی مصنّف ہفوات کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ کسی طرح ایک اعتراض کی اور زیادتی ہو جائے۔

مصنّف ہفوات کا منشاء اس روایت کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ وہ اسے حالت جماع کا نقشہ قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ اس تلطف و مہربانی کا اظہار ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں پر فرمایا کرتے تھے۔ اور جو تمدن و اخلاق کی اساس ہے جس قدر متمدن اقوام ہیں ان میں یہ بات خصوصیت سے پائی جاتی ہے کہ خاوند کو اپنے گھر میں داخل ہونے پر بیوی سے خاص طور پر تلطف سے پیش آنا چاہئے اور اس روایت میں اگر یہ صحیح ہے اسی نقشہ کو کھینچا ہے اور اس روایت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس میں اس حالت کا ذکر ہے جب کہ حضرت عائشہؓ بیٹھی ہوا کرتی تھیں۔

کیونکہ رانوں پر گھٹنوں کا ٹیکنا اور کندھوں پر ہاتھوں کا رکھنا بیٹھنے یا کھڑے ہونے کی حالت کو بتاتا ہے نہ کہ لیٹنے کی حالت کو۔ عاتق پر ہاتھ ہمیشہ بیٹھے یا کھڑے ہوئے انسان کے رکھا جا سکتا ہے۔ اور یہ بات تو بچے بھی جانتے ہیں کہ لیٹے ہوئے آدمی کی رانوں پر اگر گھٹنوں کو ٹیک دیا جائے تو وہ سخت تکلیف کا موجب ہوتا ہے نہ کہ محبت کے اظہار کا ذریعہ۔ غرض جو مفہوم مصنّف ہفوات نے اس روایت سے سمجھا ہے وہ ہرگز درست نہیں بلکہ اس کے الفاظ سے فقط یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ جب گھر میں داخل ہوتے تو اپنی بیویوں کو پیار کرتے اور یہ قابلِ اعتراض بات نہیں بلکہ ایک اُسوۂ حسنہ ہے بشرطیکہ کوئی بے رحم سنگدل یا ریاکار صوفی نہ ہو۔

بہتان دراعانت شرک از پیغمبر

ایک نئے اعتراض کے پیدا کرنے کے لئے پھر وہی کتاب فردوس آسیہ مصنّف ہفوات کے ہاتھ میں آئی ہے اور اب کے بھی اسی غرض کے لئے کہ اگر اصل کتاب کا حوالہ وہ دے دیں تو اعتراض باطل ہو جاتا ہے۔ وہ فردوس آسیہ کے حوالہ سے سنن ابوداؤد کی یہ روایت درج کرتے ہیں کہ

"جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگ تبوک سے واپس آئے تو حضرت عائشہ کی گڑیوں کا پردہ ہوا سے اُڑ گیا آنحضرت نے پوچھا یہ کیا ہے؟ حضرت عائشہ نے عرض کیا کہ یہ میری بیٹیاں ہیں۔ ان میں ایک پردار گھوڑا بھی تھا آنحضورؐ نے پوچھا کیا گھوڑے کے پَر بھی ہوا کرتے ہیں؟ حضرت عائشہ نے عرض کیا کیا حضرت سلیمان کے گھوڑے کے پَر نہ تھے پس آنحضرت ہنس کر چُپ ہو گئے۔"

اس روایت کو نقل کر کے مصنّف ہفوات ان الفاظ میں اعتراض کرتا ہے۔ "راوی نے حضرت عائشہؓ میں طباعی کی فضیلت ظاہر کرنے کی دھن میں رسالت کو غارت کر دیا۔ کیونکہ ذی روح کی تصویر سایہ دار کے دیکھنے پر پیغمبر خدا کا ہنس کر چپ رہ جانا منافی رسالت ہے۔ بلکہ ان تصاویر کا گھر سے اخراج بلکہ احراق شرط تھا جو نہ ہوا اس وجہ سے پیغمبر بشیر و نذیر نہ رہے۔ کیونکہ ان سے نہی عن المنکر ترک ہو گیا۔ پس اس بناء پر ماننا پڑے گا کہ مَعَاذَ اللّٰہِ آیت اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ[۸۰] ہے"۔ صفحہ ۲۲۔ ایڈیشن دوسرا۔ دوسرا اعتراض مصنّف ہفوات نے یہ کیا ہے کہ تبوک کے وقت حضرت عائشہ کی عمر سترہ سال کی تھی اور اس عمر میں بیاہی لڑکیاں بالعموم گڑیاں نہیں کھیلا کرتیں۔

یہ حدیث بے شک ابوداؤد میں ہے۔ لیکن اس میں ایک جملہ ایسا بھی ہے جو مصنّف ہفوات

کے اعتراض کے ایک حصہ کو باطل کر دیتا ہے اور غالباً اسی وجہ سے انہوں نے ابو داؤد کو نکال کر نہیں دیکھا بلکہ فردوس آسیہ کے حوالہ سے اعتراض کر دیا ہے اور وہ جملہ یہ ہے۔ قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ غَزْوَۃِ تَبُوْکَ اَوْ خَیْبَرَ"[۹۷] یعنی جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک سے یا خیبر سے واپس تشریف لائے تھے تب یہ واقعہ ہوا تھا۔ اس جملہ سے ظاہر ہے کہ راوی کو وقت کے متعلق شک ہے کہ وہ کون سا تھا تبوک اور خیبر میں دو سال سے زائد کا فرق ہے یعنی غزوہ خیبر دو سال پہلے ہوا ہے۔ پس اگر خیبر کو صحیح سمجھا جائے تو اس وقت حضرت عائشہ کی عمر پندرہ سال سے کچھ کم ہی بنتی ہے۔ لیکن جب راوی وقت کے متعلق خود شک میں ہے اور اس شک کا اظہار کرتا ہے اور دو ایسی جنگوں کا نام لیتا ہے جن میں دو سال سے زیادہ کا فرق ہے تو کیا تعجب ہے کہ درحقیقت جس جنگ کے بعد یہ واقعہ ہوا ہے وہ ان دونوں جنگوں کے سوا کوئی اور جنگ ہو اور خیبر سے بھی پہلے ہو اور یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اور اسی شک کو پوشیدہ رکھنے کے لئے غالباً مصنف ہفوات نے سنن ابو داؤد کی روایت کو نقل نہیں کیا جو زیادہ معروف کتاب ہے اور فردوس آسیہ کا حوالہ دے دیا ہے۔

اب میں اس اعتراض کا جواب دے کر کہ حضرت عائشہؓ کی عمر گڑیاں کھیلنے کی اجازت دے سکتی تھی کہ نہیں؟ اس دوسرے سوال کا جواب دیتا ہوں کہ کیا گڑیاں کھیلنا شرک ہے اور کیا ذی روح کی تصویر یا تمثال سے کھیلنا شرک ہے۔ اور اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ کی آیت کے خلاف ہے؟۔

اول تو میں مصنف ہفوات اور ان کی طرز کے لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ روپیہ پیسہ کا استعمال کرتے ہیں یا نہیں؟ کیا اسی کتاب کے چھپوانے پر ان کو کاتبوں، پریس مینوں، مطبع والوں، کاغذ فروشوں کو ان کی مزدوری اور ان کے بل ادا کرنے پڑے تھے یا نہیں؟ اور وہ بل کس سکہ میں انہوں نے ادا کئے تھے؟ کیا جس وقت وہ رائج الوقت سکہ کو استعمال کرتے ہیں یا کسی سے لے کر اپنی جیب میں ڈالتے ہیں تو اپنے آپ کو مشرک قرار دیا کرتے ہیں؟ یا مومن سمجھتے ہیں؟ ان کا گڑیوں پر اس طرح غضبناک ہو کر اعتراض کرنا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کو بھی نظر انداز کر کے یہ فقرہ لکھ دینا کہ۔ "رسالت کو غارت کر دیا" بتاتا ہے کہ وہ شرک کے بڑے سخت دشمن ہیں لیکن کیا روپیہ پیسہ کا استعمال انہوں نے چھوڑ دیا ہے یا ان کے کسی بزرگ مجتہد نے چھوڑ دیا ہے؟ حالانکہ روپیہ اور نوٹ اور پیسہ سب پر ذی روح کی تصویر ہوتی ہے۔

اسی طرح کیا آپ نے یا آپ کے ہم خیال لوگوں نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا ہے کہ اس میں بھی ذی روح کی تصویر بن جاتی ہے اگر کہو کہ اس تصویر کو ہم تو نہیں بناتے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ اس کو دیکھتے بھی ہیں یا نہیں یا آئینہ کا احراق کر دیا کرتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے اور اسی ذی روح کی تصویر بن جاتی ہے۔ اگر کہیں کہ وہ تو عارضی تصویر ہوتی ہے قائم نہیں رہتی تو کیا عارضی طور پر گڑیاں بنا کر پھر ان کو توڑ ڈالنا جائز ہے؟ اور اس طرح شرک نہیں رہے گا۔ اگر یہ درست ہے تو گڑیاں سب ہی ٹوٹتی رہتی ہیں ان کو کون ہمیشہ کے لئے رکھتا ہے؟۔

مجھے افسوس آتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ لوگ اپنی نادانی اور جہالت سے اسلام کو نہایت تنگ اور محدود مذہب بنا دیتے ہیں حالانکہ جس طرح کسی مذہب میں اپنے پاس سے بڑھا دینا منع ہے اسی طرح اس میں سے کسی حصہ کا کم کر دینا منع ہے۔ قرآن کریم میں جس طرح ان لوگوں کو بُرا کہا گیا ہے جو اپنے پاس سے احکام بنا کر خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں کو بھی بُرا کہا گیا ہے جو بعض احکام الٰہی کو چھپا دیتے اور مخفی کر دیتے ہیں۔ پس ایمان کا تقاضہ ہے کہ مذہب میں زیادتی اور کمی کسی قسم کی نہ کی جائے بلکہ اس کو اپنی اصل حالت میں رہنے دیا جائے۔

شرک ایک خطرناک شئے ہے اور اس کا مرتکب خدا تعالیٰ کے غضب کو اپنے اوپر نازل کر لیتا ہے لیکن جو شخص شرک کے مفہوم کو خلاف منشائے شریعت کھینچ تان کر کچھ کا کچھ بنا دیتا ہے وہ بھی کم مجرم نہیں۔ کیونکہ وہ بھی درحقیقت اپنے آپ کو خدائی کی طاقتیں دے کر شریعت کے احکام کی وسعت و تنگی کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے۔

تعجب ہے کہ ایک طرف مسلمانوں میں سے وہ لوگ ہیں جو کسی کی تعظیم کے لئے کھڑا ہونے کو شرک کہتے ہیں۔ عکس اُتروانے کو شرک کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ غلوّ کرتے کرتے شرک فی الرسالت کا ایک مرتبہ ایجاد کر لیتے ہیں اور اس طرح شرک کے مسئلہ کو جو خاص ذات باری سے تعلق رکھتا ہے مبہم و مخلوط کر دیتے ہیں بعض بچوں کی کھیلوں تک کا نام شرک رکھ دیتے ہیں۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو بزرگوں کی قبروں پر سجدہ کرتے ہیں۔ ان سے مرادیں مانگتے ہیں۔ بزرگوں کے نام پر بکرے دیتے ہیں ان کے نام پر جانوروں یا بچوں یا اور چیزوں کو وقف کر دیتے ہیں ان کو عالم الغیب خیال کرتے ہیں ان کو خدائی طاقتوں کا وارث سمجھتے ہیں اور بعض تو ان کے مکان یا مزار کی طرف منہ کر کے نماز بھی پڑھ لیتے ہیں اور یہاں تک سمجھ بیٹھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ بھی ان سے خائف اور مرعوب ہے

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

کاش یہ لوگ دین کو اس کی اصل حالت پر رہنے دیتے اور خدا تعالیٰ کے کام کو اپنے ہاتھ میں لینے کی جرأت نہ کرتے تو نہ یہ خود تکلیف میں پڑتے نہ لوگوں کے ایمان خراب ہوتے اور نہ دشمنوں کو اسلام پر ہنسی اور ٹھٹھا کرنے کا موقع ملتا۔ اور نہ یہ ضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا کی جماعت میں داخل ہو کر خدا کے غضب کو بھڑکا لیتے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ یہی لوگ جو گڑیاں کھیلنے کا نام شرک رکھتے اور حضرت عائشہؓ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بالواسطہ زبان طعن دراز کرتے ہیں قرآن کریم میں جب اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْہِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰہِ[۸۰] پڑھتے ہیں تو اس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ میں مٹی سے پرندے بنا کر ان میں پھونکتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم کے ماتحت پرندے ہو جاتے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ اگر تمثال بنانی شرک ہے تو پھر کیا مسیح علیہ السلام جو ان کے خیالوں کے مطابق پرندے بنایا کرتے تھے مشرک تھے؟ اگر مسیح علیہ السلام پرندے بنائیں اور ان کو اڑا اڑا کر دکھائیں تو وہ مشرک نہ بنیں اور خود نبی ہو کر ایسی کھیلوں میں مشغول رہیں (حَاشَا وَ کَلَّا وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ) تو ان کی ہتک نہ ہو لیکن حضرت عائشہؓ اگر بچپن کی عمر میں گڑیوں سے کھیلیں تو یہ شرک ہو جائے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر ان کو نہ روکیں تو اس سے آیت اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ باطل ہو جائے۔

پھر یہ لوگ قرآن کریم میں پڑھتے ہیں کہ یَعْمَلُوْنَ لَہٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَ تَمَاثِیْلَ وَ جِفَانٍ کَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا وَ قَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ[۸۱] یعنی حضرت سلیمانؑ کے لئے وہ لوگ ان کی مرضی کے مطابق قلعے اور مجسّمے حیوانوں کے اور بڑے بڑے برتن حوضوں کی طرح کے اور بڑی بڑی دیگیں جو ایک جگہ ٹکی رہتی تھیں بناتے تھے۔ اے داؤد کی اولاد! شکر گزاری سے گزر کرو اور میرے بندوں میں سے تھوڑے ہی ہیں جو شکر گزار ہیں۔ لیکن باوجود اس آیت کے پڑھنے کے ہر ایک قسم کا مجسمہ بنانے کو شرک قرار دیتے ہیں اگر ہر ایک قسم کا مجسمہ بنانا شرک ہے تو اللہ تعالیٰ حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ کیسا احسان ظاہر فرماتا ہے کہ تمہارے لئے ایک قوم جانداروں کے مجسّمے بنایا کرتی تھی۔ اس صورت میں تو یہ ایک غضب بن جاتا ہے نہ کہ احسان۔

مگر افسوس کہ یہ لوگ قرآن کریم کو آنکھیں بند کر کے پڑھتے ہیں اور دلوں پر غلاف چڑھا کر

پڑھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی سمجھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے اور یہ اسی طرح کورے کے کورے اس سے نکل جاتے ہیں گویا کہ انہوں نے اسے پڑھا ہی نہیں۔

مصنّف ہفوات نے شرک کی تعریف میں ذی روح کی تصویر کو شامل کیا ہے حالانکہ قرآن کریم میں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسبت آیا ہے کہ وہ تماثیل بنواتے تھے اس لفظ تماثیل کے معنوں میں خصوصیت کے ساتھ ذی روح چیزوں کے مجسّمے داخل ہیں حتیٰ کہ بعض لوگوں کے نزدیک تو تمثال کہتے ہی ذی روح چیز کے مجسّمے کو ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس وقت تمثال بنانی جائز ہوتی ہوگی شرک ان گناہوں میں سے نہیں ہے جو وقتاً فوقتاً بدلتا رہے اللہ تعالیٰ کی توحید اور تفرید کا ظہور اسی طرح ابتداء میں ضروری تھا جس قدر کہ آجکل ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر قسم کی تمثال بنانی منع نہیں ہے بلکہ ایسی ہی صورتیں ناجائز ہیں جن کے نتیجہ میں شرک پیدا ہو جایا کرتا ہے اور اس کا احتمال ہوتا ہے یا ایسی صورتوں میں تصاویر کا استعمال منع ہے جہاں شرک کے علاوہ کچھ اور اخلاقی امور مدنظر ہوں ورنہ ان کے سوا اگر کسی اور غرض کے پورا کرنے کے لئے تصویر یا تمثال ہو تو وہ منع نہیں ہے جیسے بچوں کے کھیلنے کے لئے کھلونے بنا دیئے جاتے ہیں یا گڑیاں یا اور اسی قسم کی چیزیں ان چیزوں کا تو وجود ہی ان کی حقارت کے لئے ہوتا ہے ان سے شرک کا احتمال کب ہو سکتا ہے؟ یا آج تک دنیا میں کبھی ان چیزوں سے شرک ہوا ہے؟ ادنیٰ سے ادنیٰ اقوام میں بھی کبھی گڑیوں اور کھلونوں کے سبب سے شرک پیدا نہیں ہوا۔ ہاں بزرگوں اور صلحاء ور قومی لیڈروں کی تصاویر یا ان کے مجسّموں یا اخلاق یا مخفی طاقتوں کی خیالی تصاویر یا مجسّموں سے بے شک شرک پیدا ہوتا رہا ہے اور ہوتا ہے پس ان چیزوں کی تصویریں بنانی یا ان کے مجسّمے بنانے یا شرک ہیں یا شرک کے پیدا کرنے کا موجب اور ان سے بچنے اور احتراز رکھنے کا شریعت اسلام حکم دیتی ہے۔

اس کے علاوہ شرک کے خیال سے نہیں بلکہ بعض اور مختلف وجوہ کی بناء پر خاص خاص موقعوں پر تصاویر کے استعمال کو ناپسند کیا گیا ہے۔ جیسے مثلاً خواہ گھروں میں خواہ مساجد میں اور ایسے موقعوں پر صرف تصویریں ہی نہیں بلکہ ہر ایک چیز جو ایسی زینت کی ہو کہ توجہ میں یکسوئی نہ رہنے دیتی ہو اور عبادت کی سادگی میں خلل انداز ہوتی ہو منع ہے۔ کیونکہ گو وہ شرک نہ پیدا کرتی ہو مگر ایک نیک کام میں روک ہوتی ہے جیسے کہ باجہ وغیرہ عبادت کے وقت بجانا درست نہیں ہے۔ وہ شرک کا موجب نہیں ہیں لیکن ان سے عبادات کی حقیقت میں فرق پڑتا ہے برخلاف اس کے

گڑیوں کی کھیل ایک نہایت مفید کھیل ہے اور اس سے لڑکیاں سینے پرونے اور امور خانہ داری کی تعلیم نہایت سہولت سے اور بلا طبیعت پر بوجھ پڑنے کے حاصل کر لیتی ہیں۔

روزے میں زبان چوسنا

ایک اعتراض مصنّف ہفوات نے یہ کیا ہے کہ سنن ابوداؤد کی کتاب الصوم میں حضرت عائشہ کی روایت درج ہے کہ

اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ کَانَ یُقَبِّلُھَا وَ ھُوَ صَائِمٌ وَ یَمُصُّ لِسَانَھَا۔ [۸۲] رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو بوسہ دیا کرتے تھے درانحالیکہ آپ روزہ دار ہوتے تھے اور اسی طرح آپ ان کی زبان چوستے تھے۔

اس پر مصنّف ہفوات یوں اعتراض کرتے ہیں۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مَا عَبَدْ نَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ کو ہم مقام تواضع و انکسار میں سمجھتے تھے لیکن روزہ میں زبان چوسنے سے معلوم ہوا کہ آپ نے اپنی عبادت کی واقعیت بیان کی ہے"۔ "ایمان سے بولو کیا خدا کے رسول روزہ میں ایسا فعل کر سکتے ہیں؟ کیا ایسا رسول امت کی ہدایت کر سکتا ہے؟ الٰہی توبہ توبہ"۔

یہی اعتراض مصنّف ہفوات نے صفحہ ۴۵۔ ایڈیشن اول و صفحہ ۷۰ ایڈیشن ثانی پر بعنوان "طغیانی در تقبیل و مباشرت رسول بہ صوم" درج کیا ہے۔ میں اس کو بھی اس اعتراض کے ساتھ شامل کر لیتا ہوں کیونکہ اعتراض ایک ہی قسم کا ہے۔ اس جگہ مصنّف ہفوات نے بخاری کِتَابُ الصَّوْمِ بَابُ الْمُبَاشَرَۃِ لِلصَّائِمِ کی یہ حدیث درج کی ہے عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ کَانَ النَّبِیُّ ﷺ یُقَبِّلُ وَیُبَاشِرُ وَ ھُوَ صَائِمٌ حضرت عائشہ فرماتی ہیں نبی کریم روزہ کی حالت میں بوسہ لے لیا کرتے تھے اور مباشرت بھی کر لیا کرتے تھے۔

اس حدیث پر صاحب ہفوات نے یہ اعتراض کیا ہے کہ

"باب اول میں ہم لکھ چکے ہیں کہ بحالت صوم اپنی زوجہ کا بوسہ لینا حرام نہیں لیکن مکروہ ضرور ہے۔ پس پیغمبر معصوم کا فعل مکروہ اختیار کرنا عقل سے بعید ہے اب تقبیل کے بعد بے حیا راوی نے مباشرت کا لفظ کہا ہے۔ جو بحالت صوم بمعنی اقرب بمواقعت ہے اور وہ حرام ہے نتیجہ رسول مرتکب حرام ہوئے لہٰذا رسالت سے موقوف"۔

اس کے بعد بَابُ الْقُبْلَۃِ لِلصَّائِمِ میں سے حضرت عائشہ کی یہ حدیث نقل کی ہے کَانَ

رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ یُقَبِّلُ بَعْضَ اَزْوَاجِہٖ وَ ھُوَ صَائِمٌ [۸۳] رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بعض بیویوں کا بحالت صوم بوسہ لے لیا کرتے تھے۔

صاحب ہفوات کے تمام اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے کہ بحالت صوم زبان چوسنا، بوسہ لینا، مباشرت کرنا حرام یا مکروہ ہے اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔ پس یہ احادیث شرارت سے بنائی گئی ہیں اور کتب احادیث سے ان کا اخراج ضروری ہے۔

اخراج واحراق کے متعلق تو میں پہلے جواب دے آیا ہوں اس جگہ صرف نفس حدیث کے متعلق جو اعتراض مصنّف ہفوات نے کیا ہے اس کا جواب لکھتا ہوں۔

پہلا اعتراض مصنّف ہفوات کو یہ ہے کہ ابو داؤد کی روایت میں یہ لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم روزہ میں حضرت عائشہ کی زبان چوستے تھے۔ یہ آپ کی ذات پر حملہ ہے۔ اگر مصنّف ہفوات اعتراض کرنے سے پہلے کتب اہل سنت والجماعت کو دیکھ لیتے تو ان کو اس اعتراض کے پیش کرنے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ لیکن یا تو انہوں نے بوجہ تعصب یا جہالت ان کتب کو دیکھا ہی نہیں یا دیدہ ودانستہ نظرانداز کر دیا ہے۔ ابو داؤد کی شرح عون المعبود جلد ثانی صفحہ ۲۸۵ پر اس حدیث کے متعلق لکھا ہے۔ قَالَ فِی الْمِرْقَاۃِ قِیْلَ اِنَّ ابْتِلَاعَ رِیْقِ الْغَیْرِ یُفْطِرُ اِجْمَاعًا وَاُجِیْبَ عَلٰی تَقْدِیْرِ صِحَّۃِ الْحَدِیْثِ ..... اَنَّہٗ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ کَانَ یَبْصُقُہٗ وَ لَا یَبْتَلِعُہٗ [۸۴] یعنی مرقاۃ میں لکھا ہے کہ دوسرے کا تھوک نگلنا بالاجماع روزہ توڑ دیتا ہے اور اس حدیث کے متعلق بالاجماع کہا جاتا ہے کہ اگر یہ درست فرض کرلی جائے تو اس کی یہ تاویل کی جائے گی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھوک نگلتے نہیں تھے بلکہ پھینک دیتے تھے۔ اس جواب سے ظاہر ہے کہ اہل سنت والحدیث اس حدیث کو قابل قبول ہی نہیں سمجھتے اور اگر اس کو صحیح فرض کرلیں تو اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اس صورت میں یہ تاویل کرنی پڑے گی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھوک پھینک دیتے تھے۔ پس جب ائمہ حدیث کے نزدیک یہ حدیث ہی قابل قبول نہیں اور بصورت صحت قابل تاویل ہے تو اس پر اعتراض کیسا؟ کیا کسی شخص پر اس امر کے متعلق بھی اعتراض ہوا کرتا ہے جسے وہ مانتا ہی نہیں۔ اگر کہا جائے کہ پھر انہوں نے اس حدیث کو درج کیوں کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ مؤلفین حدیث ہر حدیث جسے وہ نقل کرتے ہیں اس کے مطلب کو صحیح قرار دے کر اسے درج نہیں کرتے بلکہ اس کے لئے ان کے اور اصول ہیں اور بسا اوقات وہ ایک حدیث درج کرتے ہیں اور خود ان کو اس کے

مطلب سے اختلاف ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض دفعہ وہ ایک ہی جگہ متضاد مضامین کی روایات لے آتے ہیں اور یہ بات صرف اہل سنت والجماعت کی ہی کتب حدیث میں نہیں ہے بلکہ اہل شیعہ کی کتب حدیث میں بھی ایسا ہی کیا گیا ہے چنانچہ آپ لوگوں کی سب سے معتبر کتاب فروع کافی ہے بَابُ اَلرَّجُلُ یُجَامِعُ اَهْلَهٗ فِی السَّفَرِ میں امام عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ سے عمر بن یزید اور سہل عن ابیہ اور ابو العباس سے ایسی روایات درج ہیں۔ جن کا مطلب یہ ہے کہ رمضان میں جو شخص سفر پر ہو اسے جماع جائز ہے۔ عمر بن یزید کی روایت کے الفاظ یہ ہیں اَلَهٗ اَنْ یُّصِیْبَ مِنَ النِّسَآءِ قَالَ نَعَمْ [۸۵] یعنی کیا اسے جائز ہے کہ اپنی بیوی سے صحبت کرے فرمایا ہاں۔ مگر اسی جگہ ساتھ ہی ابن سنان نے انہی امام ابو عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ سے روایت درج کی ہے کہ ایسا کرنا بالکل درست نہیں اور راوی کے اعتراض کرنے پر کہ جب اس کو کھانا پینا جائز ہے تو جماع کیوں جائز نہیں؟ ان کی طرف سے یہ دلیل بیان کی گئی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ رَخَّصَ لِلْمُسَافِرِ فِی الْاِ فْطَارِ وَالتَّقْصِیْرِ رَحْمَةً وَ تَخْفِیْفًا لِمَوْضِعِ التَّعْبِ وَالنَّصَبِ وَوَعْثِ السَّفَرِ وَلَمْ یُرَخِّصْ لَهٗ فِیْ مُجَامَعَةِ النِّسَاءِ فِی السَّفَرِ بِالنَّهَارِ فِیْ شَهْرِ رَمَضَانَ [۸۶] یعنی اللہ تعالیٰ نے مسافر کو افطار اور قصر نماز کی اجازت تھکان اور تکلیف اور سفر کی کوفت کی وجہ سے دی ہے لیکن اسے دن کے وقت سفر میں رمضان کے مہینہ میں عورتوں سے جماع کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ان دونوں حدیثوں میں کس قدر اختلاف ہے ایک میں جماع کو جائز قرار دیا ہے دوسری میں بالکل رد کیا ہے۔ اور دونوں روایتیں ایک کتاب حدیث میں درج ہیں اور ایک ہی راوی سے درج ہیں اور بالکل پاس پاس درج ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بھول چوک سے ایسا نہیں ہوا بلکہ مصنّف نے جان بوجھ کر ان کو ایک جگہ جمع کیا ہے تا روایات کا اختلاف پڑھنے والے کے سامنے آجائے۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ مصنّف دونوں باتوں کا ایک ہی وقت میں تو قائل نہیں ہو سکتا ضرور ہے کہ وہ دونوں باتوں میں سے ایک کو ترجیح دیتا ہو گا مگر باوجود اس کے وہ درج دوسری روایت کو بھی کر دیتا ہے۔

اسی طرح روزہ میں خوشبو سونگھنے کے متعلق مختلف روایتیں فروع کافی میں درج ہیں خالد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ امام ابو عبداللہؒ روزہ میں خوشبو لگائے اور اسے تحفہ خداوندی قرار دیتے۔ حسن بن راشد امام ابو عبداللہؒ سے روایت کرتے ہیں کہ خوشبو کا سونگھنا روزہ میں منع ہے۔ [۸۷]

غرض ہر ایک روایت جو مؤلف حدیث اپنی کتاب میں درج کرتا ہے اس کی صحت کا وہ قائل

نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات اس حدیث کے مخالف رائے رکھتا ہے اور اس حدیث کو متروک یا منسوخ یا ضعیف یا ناقابل احتجاج سمجھتا ہے پس ابو داؤد میں اس روایت کے درج ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ابو داؤد اس کو صحیح سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے اس روایت کو درج کیا تھا۔

دوسرا جواب مصنف ہفوات کے اعتراض کا یہ ہے کہ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ابو داؤد نے اس حدیث کو صحیح سمجھ کر لکھا ہے تب بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ یہ مسئلہ اخلاقی نہیں ہے بلکہ شرعی ہے۔ شرعی مسائل روایت سے ثابت ہوتے ہیں نہ کہ درایت سے۔ پس اگر کسی شخص کو کسی شرعی حکم کے متعلق جو اخلاق سے تعلق نہ رکھتا ہو کوئی روایت پہنچے اور وہ اسے درج کر دے تو اس سے یہ کیوں کر سمجھا جائے گا کہ اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کیا ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے اہل سنت شیعوں پر اس لئے اعتراض کریں کہ ان کے نزدیک پاؤں پر مسح کیا جاتا ہے اور ان روایات کی بناء پر جو ان کے نزدیک ثابت ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ننگے پاؤں کے نہ دھونے سے وضو ہی باطل ہو جاتا ہے اور نماز ہی نہیں ہوتی یہ کہہ دیں کہ دیکھو شیعہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ وضو کرتے تھے اور نہ نماز پڑھتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک آپ وضو میں پاؤں نہ دھوتے تھے۔ کیا یہ اعتراض سنیوں کا درست ہو گا؟

اصل بات یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراض اخلاقی مسائل اور عقلی مسائل کے متعلق ہوا کرتے ہیں نہ کہ شرعی کے متعلق۔ فرض کرو کہ روزہ میں بعض ہلکی غذاؤں کا کھانا جائز ہوتا تو کیا دشمنان اسلام اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق رکھتے تھے کہ یہ ایک خلاف اخلاق بات ہے۔ یا مثلاً ظہر کی رکعتیں بجائے چار کے تین ہوتیں تو کیا اس پر کوئی یہ اعتراض کر سکتا تھا کہ یہ بداخلاقی ہو گئی۔ پس اسی طرح اگر کسی شخص کے نزدیک یہ ثابت ہو کہ زبان چوسنی جائز ہے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کر لیا کرتے تھے تو اس پر یہ تو اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ روایت ثابت نہیں یا یہ کہ دوسری احادیث کے خلاف ہے یا یہ کہ اس نے ایک غلط روایت کو بیان کر دیا ہے۔ لیکن اس پر یہ اعتراض ہرگز نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت یا آپ کے اخلاق پر کوئی اعتراض کیا ہے ایسے موقع پر یہ اعتراض کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک انسان کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے اس قسم کی حدیثیں جب پڑھیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے موقع پر کوئی بچہ اٹھا لیا یا اس کو اتار دیا یا اور اس قسم کا کوئی کام کیا تو بے اختیار بول

اٹھا کہ خو محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نماز ٹوٹ گیا۔ کیونکہ کنز (کنز العمال) میں لکھا ہے کہ حرکت کرنے سے نماز ٹوٹ جاتا ہے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ میرے نزدیک اس حدیث کو درست سمجھ کر بھی کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ یَمُصُّ لِسَانَهَا علیحدہ جملہ ہو یعنی راوی نے حضرت عائشہ سے یہ دو باتیں سنی ہوں کہ آنحضرت روزہ میں بوسہ لے لیا کرتے تھے اور یہ کہ آپ اپنی ازواج کی زبان بھی پیار میں چوس لیا کرتے تھے اور اس نے ان کو ایک ہی جملہ میں بیان کر دیا۔ حالانکہ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ آپ بحالت صوم ایسا کیا کرتے تھے۔ پس اس تاویل سے اس حدیث کا مطلب بالکل صاف ہو جاتا ہے اور اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت روزہ میں بوسہ لینا اور پیار سے زبان کا چوسنا ثابت ہوتا ہے افطار میں نہ کہ روزہ میں۔

اگر کہا جائے کہ اگر روزہ کی حالت میں ایسا نہیں کیا گیا تو پھر اس کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اسوہ تھے تمام مسلمانوں کے لئے اس لئے آپ کی ہر ایک حرکت کو مسلمان غور سے دیکھتے اور جو نہ معلوم ہوتی اس کے متعلق دریافت کرتے تا اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق بنائیں۔ اس وجہ سے آپ کی تمام باتیں احادیث میں بیان کی جاتی ہیں حتیٰ کہ یہاں تک بھی بیان کیا گیا ہے کہ آپ پیار سے کبھی اس جگہ گلاس پر منہ رکھ کے پانی پیتے جہاں رکھ کر آپ کی ازواج مطہرات میں سے کسی نے پانی پیا ہوتا۔ اور غرض ان احادیث کے بیان کرنے کی یہ ہے کہ تا لوگ عورتوں سے حسن معاشرت کریں اور ان کے احساسات اور جذبات کا خیال رکھیں اور ان کے حقوق کو غصب اور ان کی خواہشات کو باطل نہ کریں۔

دوسرا اعتراض مصنّف ہفوات کا یہ ہے کہ ان احادیث میں یہ بات لکھی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم روزہ میں بوسہ لے لیا کرتے تھے اور یہ بات مصنّف ہفوات کے نزدیک مکروہ ہے اور مکروہ فعل رسول نہیں کر سکتا۔

مجھے تعجب پر تعجب ان مسلمان کہلانے والوں پر آتا ہے جو اپنے پاس سے شریعت بھی بنانے لگتے ہیں۔ یہ کب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روزہ میں بوسہ لینا مکروہ ہے؟ یا آپ کی کس بات سے یہ امر مستنبط ہوتا ہے؟ خود ہی ایک مسئلہ گھڑا اور خود ہی اسے رسول پر حاکم بنا دیا جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں مسائل اخلاقیہ ہی صرف ایسے مسائل ہیں کہ جن میں استنباط اور قیاس

درست ہے لیکن تفاصیل شرعیہ ہمیشہ سند سے معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن مصنّف صاحب ہفوات کا معاملہ بالکل اُلٹ ہے وہ اپنی عقل سے ایک مسئلہ تجویز کرتے ہیں اور اس سے نص صریح کو رد کر دیتے ہیں اور نص بھی وہ کہ جو عقل سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ تفاصیل شریعت سے تعلق رکھتی ہے۔ کل کو آپ کہہ دیں گے کہ ظہر کے وقت جب کام کا یا آرام کا وقت ہوتا ہے ظہر کی چار رکعت قرار دینا خلاف عقل ہے اصل میں دو چاہئیں اور فلاں حدیث میں جو یہ آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چار رکعت ظہر کے وقت ادا کیا کرتے تھے اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ ہے کہ گویا آپ دو کی بجائے چار پڑھ کر اپنی نماز فاسد کر دیتے تھے۔ پس ان محدثین نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ظلم عظیم کیا ہے اور ایسی سب احادیث اور روایات قابلِ اِحراق اور اخراج اور تنسیخ اور محدثین قابلِ تکفیر و تفسیق ہیں۔ برایں عقل و دانش بباید گریست۔

بوسہ کو روزہ میں مکروہ قرار دینا علماء کا اجتہاد ہے اور وہ اجتہاد بھی مشروط یعنی روزہ میں جوان کو بوسہ لینا مکروہ ہے کیونکہ وہ اپنے نفس پر قابو نہیں پا سکتا ممکن ہے کہ کسی ایسی بات میں مبتلا ہو جائے جو شرعاً ناجائز ہے۔ اور اس فتوے میں شیعہ اور سنی دونوں متفق ہیں۔ مؤطا میں عبداللہ بن عباسؓ کا فتویٰ درج ہے کہ اَرْخَصَ فِیْھَا لِلشَّیْخِ وَ کَرِھَھَا لِلشَّابِّ۔ [۸۸] انہوں نے روزہ میں بوڑھے کے لئے بوسہ لینا جائز قرار دیا اور جوان کے لئے منع کیا۔ عبداللہ بن عمر کا فتویٰ صرف ایک ہے کہ بوسہ لینا دونوں کے لئے منع ہے مگر چونکہ وہ بِلا قید ہے اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ ان کا فتویٰ عام تھا یا جوانوں کے متعلق۔ امام ابو حنیفہ کا فتویٰ جو ہدایہ میں لکھا ہے یہ ہے وَ لَا بَأْسَ بِالْقُبْلَةِ اِذَا اَمِنَ عَلٰی نَفْسِہٖ وَ یَکْرَہُ اِذَا لَمْ یَأْمَنْ۔ [۸۹] یعنی جب اپنے نفس پر قابو رکھتا ہو تو جائز ہے اور اگر اپنے نفس پر قابو نہ رکھتا ہو اور خطرہ ہو کہ حدیث شریعت کو توڑ ڈالے گا تو مکروہ ہے۔ شافعیہ کا بھی یہی فتویٰ ہے کہ تُکْرَہُ الْقُبْلَةُ لِلصَّائِمِ الَّذِیْ لَا یَمْلِکُ اِرْبَہٗ [۹۰] یعنی اس کے لئے بوسہ لینا مکروہ ہے جو اپنی شہوت پر قابو نہیں رکھتا بلکہ امام شافعی کا قول تو یہ ہے کہ بوسہ لینا ہر حالت میں جائز ہے اگر اس سے بڑھ کر کوئی شخص کوئی عمل خلاف شریعت کر بیٹھتا ہے تو اس کی سزا وہ الگ پائے گا۔ یہ تو اہل سنت کے فتوے ہیں جن سے ظاہر ہے کہ بوسہ لینا روزہ میں مکروہ نہیں بلکہ اس کے لئے مکروہ ہے جو جوان ہو اور اپنی شہوت پر قابو نہ رکھتا ہو۔ اب میں اہل شیعہ کا فتویٰ درج کرتا ہوں۔

فروع کافی جلد اول میں زرارہ کی ایک روایت امام ابو عبداللہ سے درج ہے کہ لَا تَنْقُضُ

اَلْقُبْلَۃُ الصَّوْمَ [91] یعنی روزہ بوسے سے نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح منصور بن حازم سے روایت ہے کہ میں نے ابو عبداللہ سے پوچھا مَاتَقُوْلُ فِی الصَّائِمِ یُقَبِّلُ الْجَارِیَۃَ اَوِالْمَرْأَۃَ فَقَالَ اَمَّا الشَّیْخُ الْکَبِیْرُ مِثْلِیْ وَ مِثْلُکَ فَلاَ بَأْسَ وَاَمَّا الشَّابُّ الشَّبِقُ فَلاَ لِاَنَّہٗ لاَ یُؤْمَنُ وَالْقُبْلَۃُ اِحْدَی الشَّھْوَتَیْنِ۔ [92] ترجمہ۔ آپ اس روزہ دار کے متعلق کیا فرماتے ہیں جو لڑکی یا عورت کا بوسہ لے لے؟ آپ نے فرمایا بوڑھا جیسے تُو یا میں ہوں اگر بوسہ لے تو کچھ حرج نہیں اور اگر جوان ہو جو شہوت پر قابو نہ پاسکتا ہو تو اسے بوسہ لینا نہیں چاہئے۔ کیونکہ وہ محفوظ نہیں اور بوسہ بھی ایک شہوت ہے۔ یعنی اس سے چونکہ شہوت پیدا ہوتی ہے اور وہ شخص شہوت پر قابو نہیں رکھتا اس لئے ڈر ہے کہ اس قدم کے اٹھانے سے دوسرا بھی اٹھا لے۔

مذکورہ بالا فتووں سے جو سنّیوں اور شیعوں کے ہیں ثابت ہے کہ روزہ دار کو بوسہ لینا یوں تو جائز ہے مگر ایسی حالت میں منع ہے جب اس سے شر میں پڑ جانے کا خطرہ ہو اور بوڑھا چونکہ بظاہر اس شر میں پڑنے سے محفوظ ہوتا ہے اس کے لئے انہوں نے جائز رکھا ہے کہ بوسہ لے لے۔ ان فتووں کی موجودگی میں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی موجودگی میں مصنّف ہفوات کا یہ لکھنا کہ یہ ایک مکروہ فعل ہے اور رسول مکروہ فعل نہیں کر سکتا۔ کیا یہی دلالت نہیں کرتا کہ مصنّف ہفوات اپنے فتویٰ پر خدا کے رسول کو بھی چلانا چاہتے ہیں اور خود شریعت بنانے کا دعوے رکھتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں جب تشریف لے گئے ہیں اس وقت آپ کی عمر پچاس سے متجاوز ہو گئی تھی۔ پس اگر فتویٰ یہی سمجھا جائے کہ بوڑھے کو بوسہ لینا جائز ہے جوان کو نہیں تو بھی آپ کی طرف اس قسم کا عمل منسوب کرنا فتویٰ کے خلاف نہیں۔ اور مصنّف ہفوات کے مقرر کردہ معیار کے مطابق بھی محل اعتراض نہیں۔ اور اگر اس امر کو دیکھا جائے کہ یہ عمل اس شخص کی نسبت بیان کیا گیا ہے جو خدا کے سامنے مقام شہود پر کھڑا تھا اور مقام شہود میں سے بھی سدرۃ المنتہٰی پر باریاب ہو چکا تھا تو پھر تو یہ اعتراض اور بھی لغو ہو جاتا ہے۔ آپ تو عین عُنفوان شباب میں بھی اس فتویٰ کے ماتحت نہیں تھے کیونکہ آپ سے زیادہ کون شخص اپنی شہوات پر قابو رکھنے والا تھا خواہ جوان ہو خواہ پیر فرتوت۔ مصنّف ہفوات کے اعتراض کے تو یہ معنے ہیں کہ گویا نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ سب سے زیادہ رسول کریم شہوات میں پڑ جانے کے محلّ تھے۔ اس لئے آپ کو تو اس فعل کے قریب ہی نہیں جانا چاہئے تھا حالانکہ اس نہی کا باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ

زمین کو پیٹتا ہے۔ عورتیں کہتی ہیں۔ آؤ زمین کو پیٹیں اس نے کیوں تمہیں گرایا۔ مگر یہ محض ایک تماشا ہوتا ہے۔ جو بچہ کے بہلانے کے لئے ہوتا ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنسان کو اِختیار اس لئے دیا کہ چاہے بڑھ چڑھ کر انعام لے جائے چاہے سزا کا مستحق ہو جائے۔ کئی مسلمان مرد اور عورتیں کہتی ہیں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بنانا تھا بنا دیا ہمیں کسی کوشش کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو بتلاؤ پھر اب خدا کا کیا حق ہے کہ ہم میں سے کسی کو سزا دے یا انعام۔ دیکھو آگ کا کام خدا نے جلانا اور پانی کا کام ڈبونا رکھا ہے۔ اب اگر کوئی کسی چیز کے جلنے پر آگ کو یا ڈبونے پر پانی کو مارے تو چوہڑی چماری بھی کہے گی یہ پاگل ہے۔ مگر تم میں سے بہت سی عورتیں جو کہتی ہیں اگر ہماری تقدیر میں جنہم ہے تو جنہم میں ڈالے جائیں گے اور اگر بہشت ہے تو بہشت میں جائیں گے کچھ کوشش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دیکھو پانی یا آگ کو مارنے والی عورت کو تمام پاگل کہتے ہیں اس لئے کہ آگ یا پانی کا جو کام تھا اس نے وہی کیا۔ پھر خدا اگر اِنسان کو ایک کام کرنے کے لئے مجبور بنا کر پھر سزا دیتا تو کیا نَعُوْذُ بِاللّٰہِ لوگ اسے پاگل نہ کہتے۔ کیونکہ اس آدمی نے تو وہی کام کیا جو اس کی تقدیر میں تھا پھر چور، ڈاکو، جواری سب انعام کے قابل ہیں کیونکہ انہوں نے وہی کام کیا جو ان کے مقدر میں تھا اور جس کام کے لئے وہ پیدا کئے گئے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ اس کی تردید فرماتا ہے اور کہتا ہے اگر جبر ہوتا تو کافر نہ ہوتے۔ کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جو مار مار کے لوگوں سے کہے کہ مجھ کو گالیاں دو یا میرے بچہ کو مارو۔ جب تم میں سے کوئی ایسا نہیں کرتا تو خدا نے جو زبان دی، کان دیئے تو کیا اس لئے کہ مجھ کو اور میرے رسولوں کو گالیاں دو۔ جب دنیا میں کوئی کسی کو اپنے ساتھ برائی کرنے کے لئے مجبور نہیں کرتا تو خدا تعالیٰ کیوں لوگوں کو برے کاموں کے لئے مجبور کرنے لگا۔ اگر اس نے مجبور ہی کرنا ہوتا تو سب کو نیکی کے لئے مجبور کرتا۔ پس یہ غلط خیال ہے اور خدا اس کو ردّ کرتا ہے۔

عورتوں میں یہ مرض زیادہ ہوتا ہے۔ کسی کا بیٹا بیمار ہو جائے تو کہتی ہے تقدیر یہی تھی۔ کوئی اور بات ہو جائے تو تقدیر کے سر تھوپ دیتی ہے۔ میں کہتا ہوں اگر ہر بات تقدیر سے ہی ہوتی ہے اور اِنسان کا اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا تو ایک عورت روٹی کیوں پکاتی ہے تقدیر میں ہو گی تو خود بخود پک جائے گی۔ رات کو لحاف کیوں اوڑھتی ہے اگر تقدیر میں ہو گا تو خود بخود سب کام ہو جائے گا مگر ایسا کوئی نہیں کرتا۔ ایک دفعہ میں لاہور سے قادیان آرہا تھا اسی گاڑی میں پیر جماعت علی شاہ صاحب لاہور سے سوار ہوئے۔ حضرت صاحب ایک دفعہ سیالکوٹ گئے تو انہوں نے یہ فتویٰ دیا

وَ خَارِ جًا مِنْهَا۔ [94] عورت سے مباشرت کرنا اس سے چھونے کو کہتے ہیں۔ اور کبھی اس کے معنے جماع کے بھی ہوتے ہیں۔ پھر صاحب لسان نے اس حدیث کی نسبت لکھا ہے وَ فِی الْحَدِیْثِ اَنَّہٗ کَانَ یُقَبِّلُ وَ یُبَاشِرُ وَ ھُوَ صَائِمٌ اَرَادَ بِالْمُبَاشَرَۃِ الْمُلَامَسَۃِ۔ [95] یعنی حدیث میں جو آیا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کی حالت میں بوسہ لیتے تھے اور مباشرت کرتے تھے اس سے مراد چھونا اور ہاتھ لگانا ہے نہ کچھ اور۔ لسان العرب لغت کی کتابوں میں سے اہم ترین کتاب ہے اور اس کی شہادت کے بعد مجھے کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں صرف اس قدر نصیحت کر دینا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ انسان کو اعتراض کرتے وقت اس امر کو ضرور مدنظر رکھنا چاہئے کہ وہ ایسی بات نہ کہے جو قائل کے منشاء کے خلاف ہو۔ اور اگر دل سے انصاف اٹھ چکا ہو تو کم سے کم ایسی بات تو نہ کہے جس کا بطلان بالبداہت ظاہر ہو۔ کیونکہ اس قسم کی باتوں کا لکھنا اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ لکھنے والا اپنی عداوت میں حد سے بڑھا ہوا ہے اور جن کے فائدے کے لئے وہ بات کہتا ہے ان پر اس کی حرکت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ان کے دل ایسے شخص کی نسبت جذبہ حقارت و نفرت سے بھر جاتے ہیں۔

میں مصنّف ہفوات کی طرز تحریر سے سمجھتا ہوں کہ ان پر کوئی نصیحت جو غیر کے منہ سے نکلی ہوئی ہو اثر نہیں کر سکتی اس لئے میں انہیں کی مسلّمہ کتب کے حوالہ سے بتاتا ہوں کہ مباشرت حرام نہیں ہے جیسا کہ وہ لکھتے ہیں بلکہ جائز ہے۔ اور یہ بھی کہ مباشرت کے معنے کسی ایسی حرکت کے ہی نہیں ہیں جو جماع کے مشابہ ہو بلکہ اس سے مراد صرف عورتوں کا چھونا یا ان کے پاس بیٹھنا بھی ہے۔ فروع کافی جلد اول کتاب الصیام میں ایک باب ہے۔ بَابُ اَلصَّائِمُ یُقَبِّلُ اَوْ یُبَاشِرُ یعنی اس امر کے متعلق باب کہ روزہ دار بوسہ دے یا مباشرت کرے۔ اور آگے یہ حدیث لکھی ہے عَنِ الْحَلَبِی عَنْ اَبِیْ عَبْدِاللّٰہِ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنَّہٗ سُئِلَ عَنْ رَجُلٍ یَمُسُّ مِنَ الْمَرْأَۃِ شَیْئًا اَیُفْسِدُ ذٰلِکَ صَوْمَہٗ اَوْ یَنْقُضُہٗ فَقَالَ اِنَّ ذٰلِکَ یُکْرَہُ لِلرَّجُلِ الشَّابِّ مَخَافَۃً اَنْ یَسْبِقَہُ الْمَنِیُّ [96] یعنی حلبی نے امام ابو عبداللہ سے روایت کی ہے کہ آپ سے ایک ایسے شخص کے متعلق پوچھا گیا جو عورت کو کسی طرح چھوتا ہے کیا اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا یا خراب ہو جائے گا؟ فرمایا یہ بات نوجوان کے لئے مکروہ ہے اس ڈر سے کہ اس کی منی خارج نہ ہو جائے اس حدیث سے دو باتیں ظاہر ہیں ایک تو یہ کہ مباشرت کے معنی عورت کو چھونے کے ہیں نہ کہ کچھ اور۔ کیونکہ مباشرت کا باب مقرر کر کے عورت کے چھونے کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے دوسرے یہ کہ

مباشرت حرام نہیں بلکہ جوان کے لئے مکروہ اور بوڑھے کے لئے جائز ہے اور جوان کے لئے بھی اس ڈر سے مکروہ ہے کہ اس سے کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جو روزہ کے ٹوٹنے کا موجب ہو۔ لیکن اگر یہ وجہ کسی میں نہ پائی جائے تو کراہت کی پھر کوئی وجہ نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو وجہ بتائی گئی ہے وہ کسی بیمار میں ہی پائی جاسکتی ہے تندرست اور صحیح القویٰ آدمی کے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہو تا جو بیان کیا گیا ہے پس درحقیقت کسی کے لئے بھی سوائے قلیل استثنائی صورتوں کے مباشرت منع نہیں رہتی۔ اور مباشرت کو حرام قرار دینا یا تو مصنف ہفوات کی جہالت پر یا شریعت سازی کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش پر دلالت کرتا ہے۔

مصنّف صاحب ہفوات نے جو مضحکہ اوپر کی روایات بیان کر کے اُڑایا ہے اس کا جواب مکمل نہ ہو گا اگر میں اس جگہ کتب شیعہ سے چند ایک روایات درج نہ کردوں۔ کافی جلد اول صفحہ ۷۷ ۳ پر کتاب روزہ میں امام ابو عبداللہ کا فتویٰ درج ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ کیا عورت کھانا پکاتے ہوئے کھانے کا مزہ روزے میں چکھ سکتی ہے؟ تو انہوں نے کہا لَا بَأْسَ۔ [۹۷] اس میں کوئی حرج نہیں اور اسی حدیث میں لکھا ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ کیا عورت روزہ میں اپنے بچہ کو منہ میں کھانا چبا کر دے سکتی ہے؟ تو انہوں نے کہا لَا بَأْسَ۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔

اس کے بعد حسین بن زیاد کی روایت لکھی ہے کہ باورچی اور باورچن کھانا پکاتے ہوئے کھانا چکھ سکتے ہیں۔ [۹۸] مگر اس سے بڑھ کر یہ کہ مسعدہ بن صدقہ کی ایک روایت امام ابو عبداللہ سے لکھی ہے کہ حضرت فاطمہ اپنے بچوں کو رمضان کے مہینہ میں روٹی چبا چبا کر دیا کرتی تھیں۔ [۹۹] بلکہ ان روایات پر بھی طُرّہ وہ روایت ہے جس میں روزہ دار کے لئے پیاس بجھانے کا نسخہ بتایا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ امام ابو عبداللہ صاحب فرماتے ہیں کہ روزہ دار کو پیاس لگے تو اس کے بجھانے کے لئے وہ انگوٹھی منہ میں ڈال کر چُوسے۔ [۱۰۰] یہ سب روایات فروع کافی کے صفحہ ۷۷ ۳ پر درج ہیں اور شیعہ صاحبان کے لئے نہایت زبردست حُجّت ہیں۔ ان روایات کی موجودگی میں اس روایت پر اعتراض جسے خود اہل سنت کمزور اور ضعیف قرار دیتے ہیں مصنف ہفوات کے لئے کب جائز ہو سکتا ہے؟ وہ ان احادیث کو مدنظر رکھتے ہوئے بتائیں کہ بقول ان کے ادنیٰ امتی تو غبار سے بھی بے چین اور حضرت فاطمہ روٹیاں چبا چبا کر بچوں کو دیں اور خوب لطف اُڑائیں۔ آخر منہ میں اس قدر دیر روٹی چبانے سے ایک حصہ تو ان کے پیٹ میں بھی جاتا ہو گا۔

ایک اعتراض مصنف — حضرت عائشہ کا بے اجازت حضرت زینب کے گھر میں جانا

ہفوات نے یہ کیا ہے کہ ابن ماجہ بَابُ حُسْنِ مُعَاشَرَةِ النِّسَاءِ میں روایت ہے کہ

"مجھے معلوم نہ تھا کہ حضرت زینب مجھ سے ناراض ہیں اور میں بے اجازت اندر چلی گئی انہوں نے کہا یا رسول اللہ جب ابوبکر کی بیٹی اپنا کرتا اُلٹ دے تو آپ کو کافی ہے"۔

اس پر مصنف ہفوات کو یہ اعتراض ہے کہ (۱) کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فی الواقع ایسے ہی تھے جیسا کہ حضرت زینب نے بیان کیا ہے (۲) کیا حضرت زینب ایسی تھیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی کریں (۳) کیا حضرت عائشہ ایسی ناواقف تھیں کہ بِلا اجازت گھر میں گھس گئیں۔

ان تینوں سوالوں میں سے پہلے کا جواب یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز ایسے نہ تھے کہ آپ کے دل پر کسی انسان کی یا کسی مخلوق کی محبت اس طرح حاوی ہو جائے کہ ماسواء کو بُھلا دے اور نہ حضرت زینب کے قول کا یہ مطلب ہے کہ آپ ایسے ہیں۔ بلکہ اصل الفاظ حدیث کے یہ ہیں کہ اَحَسْبُکَ اِذَا قَلَبَتْ لَکَ بُنَیَّۃُ اَبِیْ بَکْرٍ ذُرَیْعَتَیْھَا۔ [۱۰۱] ترجمہ۔ کیا کافی ہے آپ کے لئے کہ جب ابوبکر کی لڑکی اپنی باہوں کو ننگی کرے۔ مصنف ہفوات کیا کے لفظ کو اُڑا کر خالی کافی ہے پر کفایت کر لیتے ہیں اور اس پر اعتراض بھی وارد کر دیتے ہیں لفظ "کیا" ایسے موقع پر کئی معنے دیتا ہے کبھی اس کے معنے تردید کے ہوتے ہیں یعنی ایسا نہیں ہے کبھی اس کے معنے سوال کے ہوتے ہیں کیا یہ بات درست ہے؟ اور کبھی اس کے معنی تعریف کے ہوتے ہیں یعنی ایک شخص کسی کی نسبت کوئی بات کہتا ہے یا سمجھتا ہے تو اس پر طنز کرنے کے لئے ایسے الفاظ کہہ دیئے جاتے ہیں اور کبھی اس کے معنی ایک بات کے اثبات کے بھی ہوتے ہیں یعنی سوال سے مراد کسی امر کا اقرار ہوتا ہے نہ کہ سوال۔ لیکن یہ معنی بعید مجاز کے ہیں اور اسی وقت اس کے یہ معنی کئے جا سکتے ہیں جب کہ اصل معنے یا مجاز قریب کے معنے نہ لئے جا سکیں یا قرینہ ان پر شاہد ہو۔

اس جگہ اس کے معنی حقیقی یا مجاز قریب کے لئے جا سکتے ہیں۔ اور وہی بر محل ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ بات کو پھرا کر کہیں کا کہیں لے جایا جائے۔ بات صاف ہے کہ حضرت زینب استفہام انکاری کے طور پر کہتی ہیں کہ کیا عائشہ کا اپنی باہوں کو ننگا کر لینا آپ کے لئے کافی ہے؟ یعنی ایسا نہیں

ہے۔ یہ تمہید باندھ کر وہ آگے اپنا مطلب کہنا چاہتی ہیں جس کے لئے جیسا کہ الفاظ حدیث سے ظاہر ہوتا ہے وہ حضرت عائشہ سے مخاطب ہو کر باتیں کرنے لگتی ہیں۔

پس یہ اعتراض ہی بالکل لغو ہے کہ کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے تھے یا یہ کہ آپ کی بیویاں ایسی گستاخ تھیں۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں الفاظ حدیث میں تو اس الزام کی نفی کی گئی ہے۔ پس خود الفاظ حدیث ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ناواجب محبت سے اور ام المومنین کو الزام گستاخی سے بری کر رہے ہیں۔ پھر تعجب ہے مصنّف صاحب ہفوات کی عقل پر کہ وہ اس سے اُلٹا نتیجہ نکال رہے ہیں اور لفظ کیا کو بالکل نظر انداز کر کے اپنا بغض نکالنا چاہتے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ حضرت عائشہؓ جن سے شطر دین سیکھنے کا حکم تھا بِلا اجازت حضرت زینبؓ کے گھر کیوں چلی گئیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ ہرگز زینب کے گھر میں نہیں گئیں پس حضرت عائشہؓ پر اعتراض ہی فضول ہے۔ اصل الفاظ حدیث کے یہ ہیں کہ مَا عَلِمْتُ حَتّٰی دَخَلَتْ عَلَیَّ زَیْنَبُ بِغَیْرِ اِذْنٍ وَ ھِیَ غَضْبٰی ثُمَّ قَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ [۱۰۲] یعنی مجھے یہ امر نہیں معلوم ہوا حتیٰ کہ زینب میرے گھر میں بغیر اِذن کے داخل ہو گئیں اس حال میں کہ وہ غضب میں تھیں۔ پھر کہا یا رسول اللہ۔ اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زینب حضرت عائشہ کے گھر میں چلی گئی نہ یہ کہ حضرت عائشہ حضرت زینب کے گھر میں گئیں۔ مصنّف ہفوات کو دھوکا اس سے لگا ہے کہ ابن ماجہ کے بعض حواشی میں غلطی سے اس کے اُلٹ معنی لکھے گئے ہیں۔ چونکہ خود ان کو تمیز نہ تھی انہوں نے جھٹ ان معنوں کو لے کر اعتراض کر دیا۔ کسی عرب کے سامنے اس حدیث کو رکھ کر پوچھو وہ یہی معنے کرے گا کہ حضرت زینب حضرت عائشہ کے گھر گئی ہیں نہ حضرت عائشہ حضرت زینب کے گھر۔ کیونکہ مَا عَلِمْتُ وَ ھِیَ غَضْبٰی اور ثُمَّ کے الفاظ دوسرے معنی کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔ فقرہ کی بناوٹ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ داخل ہونے والی زینب ہیں نہ کہ عائشہ۔ ابن ماجہ مطبوعہ مصر میں بھی اس حدیث کو اسی طرح لکھا ہے جس طرح میں نے بیان کیا ہے اور حاشیہ سندہی میں لکھا ہے وَ عِنْدَ مَجِیْئِ زَیْنَبَ ظَھَرَ لَھَا تَمَامُ الْحَقِیْقَۃِ۔ [۱۰۳] یعنی زینب کے آنے پر عائشہ کو سب حال معلوم ہوا جس سے معلوم ہوا کہ سندہی کے نزدیک بھی اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ زینب عائشہ کے گھر میں آئی تھیں نہ کہ عائشہ زینب کے گھر گئی تھیں۔

اس جگہ یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ خواہ زینب عائشہ کے گھر بلا اجازت گئیں یا عائشہ زینب

کے گھر گئیں بہر حال یہ اعتراض تو قائم رہا کہ آنحضرت ﷺ کی ایک بیوی بِلا اِذن خلاف شریعت کے طور پر دوسری بیوی کے گھر میں چلی گئیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض اس وقت پڑ سکتا ہے جب کہ حقیقت سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ لیکن ان واقعات کو مدنظر رکھ کر جن کے ماتحت یہ معاملہ ہوا ہے اعتراض تو پڑتا ہی نہیں یا اس کا وہ وزن نہیں رہتا جو اس کو دیا گیا ہے۔ وہ واقعہ جو اس حدیث میں بیان ہوا ہے اس طرح ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جو لوگ ھدایا لاتے ہیں وہ اس دن تک انتظار کرتے رہتے ہیں جس دن کہ حضرت عائشہ کے گھر میں آنحضرت ﷺ کی باری ہو۔ اور یہ بات ان کو طبعاً ناگوار گزری۔ اس پر انہوں نے مشورہ کر کے حضرت فاطمہ کو آنحضرت ﷺ کے پاس بھیجا کہ آپ یہ اعلان کر دیں کہ جو لوگ ھدایا لاتے ہیں سب بیویوں کی باری میں مساوی طور پر لایا کریں حضرت عائشہ کی خصوصیت نہ مدنظر رکھا کریں۔ اس امر کا اعلان اس شخص کی طرف سے جس کے پاس ھدایا آتے ہوں نہایت مخفی طور پر ھدایا لانے کی ترغیب پر بھی مشتمل قرار دیا جا سکتا تھا اس لئے رسول کریم ﷺ جو اخلاق فاضلہ کا نمونہ تھے ایسے اعلان کا کیا جانا کب پسند فرما سکتے تھے۔ آپ نے حضرت فاطمہ سے صاف کہدیا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ چونکہ آپ کی بیویاں اس امر کو اور نظر سے دیکھتی تھیں اور اس میں اپنی ہتک خیال کرتی تھیں انہوں نے پھر زور دینا چاہا اور اسی وقت حضرت زینبؓ دوبارہ اس امر کو پیش کرنے کے لئے رسول کریم ﷺ کے گھر تشریف لائیں۔ اور چونکہ اسی وقت حضرت فاطمہ اس گھر سے رسول کریم ﷺ سے بات کر کے نکلی تھیں انہوں نے اِذن لینے کی ضرورت نہیں سمجھی اور خیال کیا کہ اس عرصہ میں کوئی ایسی صورت نہیں پیدا ہو سکتی جس میں مجھے حجاب کی ضرورت ہو۔ پس اس وقت ان کا داخل ہونا ایسا ہی ہے جیسے کسی ایسے گھر میں جس میں سے کہ دوسرے لوگ نکل رہے ہوں کوئی دوسرا شخص اس خیال پر گھس جائے کہ پردہ ہی ہو گا۔

حضرت فاطمہ کو جس قدر پردہ رسول کریم ﷺ سے ہو سکتا تھا اس سے بہت کم پردہ زینب کو تھا جو آپ کی بیوی تھیں پس حضرت فاطمہ کے آنے کے بعد ان کا اس جوش میں جو اس واقعہ سے ان کی طبیعت میں پیدا ہو گیا تھا بِلا اِذن اندر چلے جانا ہرگز اس نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا جس نظر سے مصنّف ہفوات کی آنکھ نے اسے دیکھا ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ ایک اجتہادی غلطی تھی اور بس۔

حضرت عائشہ کا حبشیوں کا ناچ دیکھنا

اس کے بعد مصنف ہفوات نے یہ اعتراض کیا ہے کہ بخاری کتاب الصلوٰۃ اور کتاب العیدین اور کتاب الجہاد کی بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت عائشہ کو حبشیوں کا ناچ دکھایا اور یہ کہ آپ کے گھر میں بعض لڑکیوں نے شعر پڑھے۔ مصنف ہفوات اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ (۱) حضرت عائشہ نے نامحرموں پر نظر کیوں ڈالی؟ (۲) رسول کریم ﷺ نے منع کرنا تو الگ رہا خود ان کو ناچ کیوں دکھایا؟ (۳) باوجود حضرت ابوبکرؓ کے شعر پڑھنے سے اور حضرت عمرؓ کے ناچ سے روکنے کے آپ نہ سمجھے کہ یہ منع ہے اور فرمایا کہ ناچے جاؤ چونکہ یہ امور آپ کی شان کے خلاف ہیں معلوم ہوا کہ یہ احادیث باطل ہیں۔

یہ سوال کہ گانے سے رسول کریم ﷺ نے کیوں منع نہیں فرمایا اس کا جواب یہ ہے کہ شعر خوش الحانی سے پڑھنا اسلام میں جائز ہے اور جب شریعت کے باقی احکام کو جو پردہ اور فحش سے اجتناب کرنے کے متعلق ہیں مدنظر رکھ کر کوئی عورت یا مرد شعر پڑھے تو اسے شریعت باز نہیں رکھتی نہ کہیں قرآن کریم میں نہ حدیث میں یہ مذکور ہے کہ شعر کا خوش الحانی سے پڑھنا حرام اور ممنوع ہے۔ پھر رسول کریم ﷺ جو دین فطرت لے کر آئے تھے اس امر سے کیوں روکتے؟ حضرت ابوبکر نے جو روکا تو یہ ان کا اجتہاد تھا اور رسول کریم ﷺ نے چونکہ ان کو روکنے سے منع فرما دیا تھا معلوم ہوا کہ ان کا یہ اجتہاد غلط تھا۔ پس جب شارع نبی ایک امر کو جائز قرار دیتا ہے تو کسی شخص کا حق نہیں کہ عورت یا مرد کو خوش الحانی سے شعر پڑھنے سے روکے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ شریعت کے پردہ کے حکم پر عمل کیا جائے اور فحش کلامی سے یا فحش کی طرف توجہ دلانے والے جذبات سے پرہیز کیا جائے۔ اگر قومی ترانے یا وعظ ونیکی کی باتیں یا مناظر قدرت کی تشریح یا قومی جذبات کے اُبھارنے کے اشعار ہوں یا جنگوں کے واقعات یا تاریخی امور ان میں بیان ہوں تو ایسے اشعار کا پڑھنا یا سننا نہ صرف یہ کہ ممنوع نہیں بلکہ بعض اوقات ضروری اور لازمی ہے اور فطرت کے صحیح اور اعلیٰ مطالبہ کا پورا کرنا ہے اور جو شخص اس امر کو ناجائز قرار دیتا یا اسے بُرا مناتا ہے وہ جاہل مطلق ہے اور مذہب اور فطرت کے تعلق اور شریعت کے اسرار سے قطعاً ناواقف ہے اور پھر جو شخص رسول کریم ﷺ کے فعل کو دیکھ کر بھی یہ کہتا ہے کہ اگر آپ نے اس کی اجازت دی ہو تو اس سے آپ پر اعتراض آتا ہے اس کی مثال اس پٹھان کی سی ہے جس کی نسبت پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس نے حدیث میں یہ پڑھ کر کہ رسول کریم ﷺ نے نماز میں حرکت کی تھی کہدیا تھا کہ

خو محمد صاحب کا نماز ٹوٹ گیا۔ کیونکہ کنز میں لکھا ہے کہ حرکت سے نماز ٹوٹ جاتی ہے

نادان مصنف ہفوات بھی اس پٹھان کی طرح نہیں جانتا کہ شریعت کے احکام کا بیان کرنا رسول کا کام ہے نہ مصنف ہفوات جیسے لوگوں کا جو کنویں کے مینڈک کی طرح ایک محدود دائرے میں چکر لگاتے رہتے ہیں اور قانون قدرت کی وسعت اور احکام شریعت کی غرض اور غایت سے ایسے ہی نابلد ہیں جیسے کہ ایک جانور ایجادات انسانیہ سے۔ خدا کے رسول نے جب ایک کام کر کے دکھا دیا تو اس کے خلاف جو مسئلہ کوئی بیان کرتا ہے وہ لغو اور بے ہودہ ہے اور اس سے اس مسئلہ کے بیان کرنے والے کی جہالت اور حماقت سے زیادہ اور کچھ ثابت نہیں ہوتا سوائے اس صورت کے کہ اس سے نادانستہ ایسا مسئلہ بیان ہوا ہو جو اقوال وافعال رسالت مآب کے خلاف ہو۔ مصنف ہفوات کو یاد رکھنا چاہئے کہ خوش الحانی سے شعر پڑھنا یا سننا ایک فطرتی تقاضا ہے اور بچپن سے اس کی لذت روح انسانی میں رکھی گئی ہے اور اسلام دین الفطرت ہے۔ خدا کا کلام اور اس کا فعل مخالف نہیں ہو سکتے۔ جس خدا نے یہ جذبہ انسان کے اندر رکھا ہے وہ اس جذبہ کے صحیح استعمال سے اسے روک نہیں سکتا تھا۔

باقی رہا دوسرا سوال کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت عائشہ کو حبشیوں کا ناچ کیوں دکھایا اور غیر محرم پر نظر کیوں ڈلوائی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں اعتراضات بالکل باطل اور جھوٹے ہیں۔ نہ رسول کریم ﷺ نے حضرت عائشہ کو ناچ دکھایا اور نہ غیر محرموں پر نظر ڈلوائی ہے۔ اور مصنف ہفوات نے دیدہ و دانستہ یہ اعتراض کیا ہے کیونکہ جو احادیث انہوں نے نقل کی ہیں وہی ان اعتراضات کو رد کر رہی ہیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ وَ كَانَ يَوْمُ عِيْدٍ يَلْعَبُ السُّوْدَانُ بِالدَّرَقِ وَالْحِرَابِ فَاِمَّا سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَاِمَّا قَالَ اَتَشْتَهِيْنَ تَنْظُرِيْنَ فَقُلْتُ نَعَمْ فَاَقَامَنِىْ وَرَاءَهٗ خَدِّىْ عَلٰى خَدِّهٖ وَهُوَ يَقُوْلُ دُوْنَكُمْ يَا بَنِىْ اَرْفِدَةَ حَتّٰى اِذَا مَلِلْتُ قَالَ حَسْبُكِ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَاذْهَبِىْ۔ [۱۰۴] یعنی عید کا دن تھا اور حبشی لوگ ڈھالوں اور برچھوں سے کرتب کر رہے تھے مجھے یاد نہیں کہ میں نے خود کہا یا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تو دیکھنا چاہتی ہے؟ اس پر عائشہ فرماتی ہیں کہ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ پس آپ نے مجھے اپنے پیچھے کھڑا کر لیا اور آپ کی گال کے ساتھ میری گال لگی ہوئی تھی پھر آپ نے فرمایا اپنا کام کئے جاؤ اے بنو ارفدہ! یہاں تک کہ جب میں ملول ہو گئی آپ نے فرمایا بس؟ میں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا اچھا جاؤ۔

حدیث کے الفاظ واضح ہیں اس کا مطلب ظاہر ہے اس میں کسی اندر کے دربار کے ناچ کا ذکر نہیں جنگی مشق کا ذکر ہے جو مسجد کے صحن میں صحابہ رسول کریم ﷺ کر رہے تھے۔ پس اس پر یہ اعتراض کرنا کہ رسول کریم ﷺ نے اپنی بیوی کو ناچ دکھایا پس چاہئے کہ مسلمان تھیٹروں اور ناچ گھروں میں اپنی عورتوں کو لے جایا کریں اول درجہ کی بے حیائی اور شرارت ہے اور ایسا انسان جو جنگ کے فنون کو ناچ گھروں کے اعمال سے تشبیہہ دیتا ہے یا تو خر دماغ ہے جس کی عقل میں ادنیٰ سے ادنیٰ بات بھی نہیں آسکتی یا بے شرمی و بے حیائی میں اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی بے شرمی کا خیال کرنا بھی مشکل ہے۔ کیا فنون حرب کا استعمال ناچ ہوتا ہے تو کیا جنگ کے موقع پر آگے پیچھے حرکت کرنا ناچ ہے؟ اور حضرت علیؓ جنہوں نے سب عمر جنگ میں گزار دی وہ ہمیشہ ناچ گھروں کو ہی زینت دیتے رہے تھے؟ اگر کہو کہ وہ تو جنگ کے موقع پر اس فن کا استعمال کرتے تھے نہ کہ بے موقع۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا کوئی فن بِلا سیکھے کے بھی آجاتا ہے؟ آخر پہلے تلوار پکڑنی اور پیترے بدلنے انہوں نے سیکھے ہوں گے۔ نیزے کا وار اور ڈھال کا استعمال کرنے کی مشق کی ہوگی تبھی آپ جنگ میں ان چیزوں کو استعمال کرسکتے ہوں گے تو کیا ان مشق کے ایام میں آپ ناچا کرتے تھے؟ وہ فن جو اعلیٰ درجہ کے شریف فنون میں سے ہے جس کے ساتھ قوموں کی عزت اور ترقی وابستہ ہے اس کو ناچ قرار دینا سوائے بے شرموں اور بزدلوں کے کسی کا کام نہیں۔ اور اس کو ناچ قرار دینا گویا خدا کے انبیاء اور اولیاء کو ایکٹر قرار دینا ہے کیونکہ بہت سے انبیاء اور اولیاء فنون حرب میں ماہر تھے اور ان کو استعمال کرتے تھے۔

مصنّف ہفوات نے اس امر سے بالکل آنکھیں بند کرلی ہیں کہ جس قدر زندہ قومیں ہیں وہ وقتاً فوقتاً فوجی کرتب دکھاتی رہتی ہیں جس سے ان کی ایک طرف تو یہ غرض ہوتی ہے کہ سپاہیوں کے ہاتھ سست نہ ہو جائیں اور ان کی مشق جاتی نہ رہے۔ دوسرے نئی پود کے دل میں جنگی ولولوں کا پیدا کرنا اور ان کے دلوں میں اپنی ذمہ داری کا شعور پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ تیسرے اس فطرتی تقاضا کا پورا کرنا مطلوب ہوتا ہے جو انسان کی طبیعت میں حصول فرحت و سرور کی خواہش کے رنگ میں ازل سے ودیعت کیا گیا ہے۔ جو لوگ نادان اور بے وقوف ہوتے ہیں وہ اس خواہش کو لغو اور بے ہودہ طریق پر پورا کرتے ہیں۔ لیکن نیک اور صالح لوگ اس خواہش کو ایسے رنگ میں پورا کرتے ہیں کہ خوشی کا سامان بھی بہم پہنچ جاتا ہے اور نیک نتائج بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس بے وقوف ہے وہ شخص جو ان مشقوں اور مظاہروں کو ناچ گھروں والے ناچوں سے تشبیہہ دیتا ہے اور

ان کو اخلاق کے خلاف قرار دیتا ہے۔ درحقیقت کسی قوم کی مُردنی کی اس سے بڑھ کر کوئی علامت نہیں کہ اس کے افراد فنون جنگ سے نفرت کرنے لگیں اور ان کو شان کے خلاف سمجھنے لگیں اور جس خاندان سے مصنّف ہفوات اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں اس کی ہلاکت کی ایک بہت بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ عیش پرست اور نکما ہو گیا تھا اور مجھے تعجب ہے کہ باوجود اس سخت گرفت کے جو مصنّف ہفوات کے خاندان پر اللہ تعالیٰ نے کی ہے ان کی حکومت چھین لی ان کا مال چھین لیا ہے ان کی عزت چھین لی ہے ابھی تک ان کے اندر انہی بیگمات کے خیالات جوش مار رہے ہیں جنہوں نے دہلی کی جنگ کے موقع پر بادشاہ کو رو رو کر مجبور کر دیا تھا کہ وہ ان کے مکان کے سامنے سے جو بہترین موقع توپ چلانے کا تھا توپ کو ہٹا لے اور اس طرح اپنی بزدلی کا اظہار کر کے اور اس کے مطابق بادشاہ سے عمل کرا کے شاہی خاندان اور دلی کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا تھا۔ اگر شاہی خاندان کی عورتیں فنون جنگ کو دیکھنے کی عادی ہوتیں اگر ان کو جنگی مظاہرات کا معائنہ کرنے کا موقع دیا جاتا اگر وہ اپنے زمانہ کے ہتھیاروں کے استعمال کو دیکھ دیکھ کر ان کی ہیبت کو دل سے نکال چکی ہوتیں تو ایسی بد اندیشانہ حرکات ان سے کیوں ظاہر ہوتیں۔ اور اگر بادشاہ فنون جنگ کے ماہر ہوتے اور ان کی عمر اس قسم کے کاموں میں بسر ہوتی وہ جنگ اور اسکے نتیجہ سے آگاہ ہوتے تو وہ بیگم کی خواہش کو کیوں مانتے؟ وہ اس کی موت کو اس کی خواہش کے پورا کرنے سے ہزار درجہ بہتر سمجھتے کیونکہ ملک کی عزت اور اس کے وقار کے مقابلہ میں کسی فرد کی خواہ وہ بادشاہ کی چہیتی بیوی ہی کیوں نہ ہو کیا قدر ہوتی ہے؟۔

لوگ کہتے ہیں کہ بیگم نے انگریزوں سے ساز باز کیا ہوا تھا اور وہ تکلّف سے کام لیتی تھی مگر میں کہتا ہوں اگر جنگی مظاہرات ہوتے رہتے اور توپیں دغتی رہتیں اور ان کے دیکھنے اور ان میں حصہ لینے کا بیگمات کو موقع ملتا رہتا تو بیگم یہ بہانہ کیونکر بنا سکتی تھیں کیا بادشاہ اور دوسرے لوگ ان کو یہ نہ کہتے کہ یہ بات تو ہمیشہ تم دیکھتی رہی ہو آج یہ نیا ڈر کہاں سے پیدا ہو گیا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت جنگ میں حصہ لینے کے لئے نہیں پیدا کی گئی۔ لیکن عورت کا فنونِ حرب سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے ورنہ اگر اس کا دل تلوار کی چمک سے کانپ جاتا ہے اور اس کا خون بندوق یا توپ کی آواز کو سن کر خشک ہو جاتا ہے تو وہ اپنے بچوں کو خوشی سے میدان جنگ میں جانے کی اجازت کب دے سکتی ہے؟ اور ان کے دل سے ان کے جھوٹے خوف کو کب دور کر سکتی ہے؟ وہی اور صرف وہی عورت جو رات اور دن اپنے زمانہ کے ہتھیاروں کی

نمائش کو دیکھتی رہی ہے اور اس کے دل سے ان کا خوف دور ہو جاتا ہے اور وہ ان کو ایک کھلونا سمجھنے لگتی ہے اپنے بچوں کو اس ذمہ داری کے اٹھانے کے لئے تیار کر سکتی ہے جو اپنے مذہب اور اپنے ملک کی طرف سے ان پر عائد ہونے والی ہے۔ اور اس میں کیا شبہ ہے کہ جنگ سے قریب ترین نظارہ مصنوعی جنگ کا ہوتا ہے جس میں دیکھنے والا بسا اوقات یہ خیال کرتا ہے کہ اب ایک شخص دوسرے کے وار کے آگے زخمی ہو کر گر جائے گا اور ہتھیار کا حقیقی رُعب اس سے قائم ہوتا ہے۔

غرض جنگ کے کرتب کروانے یا کرنے ناچ کروانا یا کرنا نہیں ہے نہ ان کا عورتوں کو دکھانا ناچ دکھانا ہے بلکہ جنگ کے کرتبوں کی مشق کرانا مذہبی فرض ہے اور ملک کا حق ہے اور زندگی کا نشان ہے اور عورتوں کو ان فنون کے دیکھنے کا موقع دینا ایک قومی ذمہ داری ہے جس کی طرف سے بے توجہی غداری ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر ممکن ہو سکے تو ان کو فنون جنگ سکھانے چاہئیں جیسا کہ عرب لوگ سکھاتے تھے تاکہ وقت پر وہ اپنی عصمت اور عزت کی حفاظت کر سکیں اور مصیبت کی ساعت میں اپنے مردوں اور اپنے بھائیوں کا ہاتھ بٹا سکیں۔ اسلام کی تاریخ ان مثالوں سے پُر ہے کہ عورتوں نے جنگ میں خطرناک اوقات میں جب اور لشکر میسر نہ آسکتے تھے مردوں کا ہاتھ بٹایا اور ان کے ساتھ فتح میں شریک ہوئیں۔ ان کے حالات ہماری رگوں میں فخر کی لہر پیدا کر دیتے ہیں اور ان کے کارنامے ہماری ہمتوں کو بلند وبالا کر دیتے ہیں اور مصنّف ہفوات ہمیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ نچنیاں تھیں اور قوم اور ملک کے لئے ننگ۔ وہ غیر مردوں کا چہرہ دیکھنے والی تھیں اور حیا اور شرم سے عاری۔ مگر میں کہتا ہوں یہ ننگ ہمارے لئے ستر کا موجب ہے اور یہ عار ہمارے لئے عزت کا باعث ہے۔ تیری عزت اور تیری حیا تیرے لئے مبارک ہو کہ وہ ہمارے لئے موجب ننگ وعار ہے۔

مصنّف ہفوات کا یہ اعتراض کہ کیا حضرت عائشہ نے غیر محرم پر نظر ڈالی اور رسول کریم ﷺ نے نظر ڈلوائی ایسا ہی بے وقوفی کا سوال ہے جیسا کہ پہلا۔ غیر محرم پر نظر نہ ڈالنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی صورت اور کسی غرض سے غیر محرم کے کسی حصہ پر نظر ڈالنی منع ہے۔ اگر شریعت اسلامیہ کا یہ مسئلہ ہوتا تو عورتوں کو چار دیواری سے باہر نکلنے کی اجازت نہ ہوتی اور مکان بھی بند دریچوں کے بنائے جاتے جس قسم کا کہ ظالم بادشاہ قید خانے تیار کراتے ہیں۔ مصنّف ہفوات کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ عورت بھی اسی قسم کی انسان ہے جس قسم کا کہ مرد ہے اور اس کی طبعی

ضروریات بھی مرد ہی کی طرح ہیں۔ خدا کا طبعی قانون دونوں پر یکساں اثر کر رہا ہے اور وہ قانون صحت کی درستی اور جسم کی مضبوطی کے لئے اس امر کا مقتضی ہے کہ کھلی ہوا میں انسان پھرے اور روزانہ کافی مقدار میں نقل و حرکت کرے اور محدود دائرہ میں بند ہونے کا خیال اس کے اعصاب میں کمزوری نہ پیدا کرے جس خدا نے عورت کو ان قوتوں اور ان تقاضوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اور جس خدا نے اس کا ایک ہی علاج مقرر فرمایا ہے اس کا کلام عورت کو اس ایک ہی علاج سے محروم نہیں کر سکتا سزا ایک آدمی کو دی جاسکتی ہے دو کو دی جاسکتی ہے لیکن قوم کی قوم کو نسلاً بعد نسلٍ قید میں نہیں رکھا جاسکتا۔ آخر فطرت بغاوت کرے گی اور قید خانوں کی دیواروں کو توڑ کر رکھ دے گی۔

شریعت کا مقرر کردہ پردہ فطرت کے خلاف نہیں ہے اس کو جو لوگ توڑنے کی کوشش کرتے ہیں وہ فطرت کے تقاضے کو نہیں بلکہ ہوا و ہوس کے تقاضے اور عیش پرستی کے جذبات کو پورا کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں فطرت کے تقاضے قانون قدرت کے اندر اپنے نشان رکھتے ہیں اور ان کا توڑنا خدا کی کُل کائنات کو مخالفت پر کھڑا کر دیتا ہے لیکن عورت کا بے محابا ہر مرد کے سامنے ہونا اس کے ساتھ بے تکلف ہونا اور علیحدہ ہو جانا کسی ایک قانون قدرت کو بھی مخالفت پر نہیں آمادہ کرتا بلکہ اُلٹا انسان کو اس کے اعلیٰ مرتبہ سے گرا کر حیوانی تقاضوں اور جذبات کے گڑھے میں دھکیل دیتا ہے پس اس پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا لیکن اس سے زیادہ پردہ کرانا یا اس کی خواہش کرنی خدا کے حکم کی اتباع نہیں ہے بلکہ اس کا مقابلہ ہے اور صرف ایک عارضی اور زیادہ اہم ضرورت کے لئے اس کو جاری کیا جاسکتا ہے جس طرح کہ ایک طبیب ایک بیمار کو چلنے پھرنے سے جو فطری تقاضے ہیں روک دیتا ہے۔

جب کہ شریعت نے عورت کو باہر نکلنے کی اجازت دی ہے اور صرف منہ کا ایک حصہ اور بدن کو ڈھانپنے کا حکم دیا ہے اور ہاتھ اور پاؤں اور دوسری چیزیں جو ایسے موقع پر ظاہر ہو ہی جاتی ہیں ان کو ظاہر کر دینے کی اجازت دی ہے تو یہ ضروری بات ہے کہ ایک عورت جو گھر سے باہر اس حالت میں نکلے گی اس کی نظر مردوں کے جسم کے بہت سے حصوں پر اسی طرح پڑے گی جس طرح کہ عورت کے بعض حصوں پر مرد کی پڑتی ہے۔ غضِ بصر کے حکم نے یہ بتا دیا ہے کہ اصل چیز جو پردہ کی جان ہے دونوں کی نظروں کو ملنے سے بچانا ہے اور جسم کا وہ حصہ جس پر نگاہ ڈالتے ہوئے آنکھیں ملنے سے رہ ہی نہیں سکتیں یا اس امر کی احتیاط نہایت مشکل ہو جاتی ہے وہ چہرہ ہے۔ بقیہ جسم کو جب کہ وہ مناسب کپڑوں سے ڈھکا ہوا ہو نہ چھپانے کی ضرورت ہے نہ اسے چھپایا جاسکتا ہے جب

تک کہ عورتیں بازاروں اور گلیوں میں پھرنا نہ چھوڑ دیں یا قناتیں تان کر وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر نہ کریں لیکن کیا یہ ہر عورت کے لئے ممکن ہے؟

امراء کی عورتیں تو اپنے مکانوں کی وسیع چار دیواریوں میں پھر بھی سکتی ہیں غرباء کی عورتیں کہاں جائیں اور اوسط طبقہ کی عورتیں کس طرح گزارہ کریں؟ مگر امراء کی عورتوں کو بھی میل ملاقات کے لئے ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف جانا پڑتا ہے جب تک کہ ان کی تمام زندگی کو ایک سخت قید کی ہم شکل نہ بنا دیا جائے اس وقت تک ان کو بھی کبھی نہ کبھی باہر نکلنا ہو گا اور ان کی نظر بھی لازماً گلیوں اور سڑکوں پر پھرنے والے اور برآمدوں اور سٹیشنوں اور گاڑیوں پر بیٹھنے والے لوگوں کے بعض حصہ جسم پر پڑے گی سوائے اس صورت کے کہ گھر سے نکلتے ہی ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی جائیں۔ جو عورت یہ کہتی ہے کہ باوجود باہر نکلنے کے اس کی نظر کسی مرد کے کسی حصہ جسم پر کبھی نہیں پڑی وہ جھوٹی ہے اور جو مرد یہ امید رکھتا ہے کہ اس کی بیوی نے کسی مرد کو مذکورہ بالا طریق پر کبھی نہیں دیکھا وہ پاگل ہے۔

پردہ مرد اور عورت کے لئے برابر ہے۔ جب عورت باہر برقع یا چادر اوڑھ کر نکلتی ہے تو کیا مردوں کو اس کے پاؤں اور اس کی چال اور اس کا قد اور اس کے ہاتھوں کی حرکت اور ایسی ہی اور کئی چیزیں نظر نہیں آتیں؟ اور کیا ان کا پردہ ممکن ہے؟ اگر عورت کے بعض حصے مرد کو ضرور نظر آتے ہیں اور ان کا پردہ ناممکن ہے اور اس سے بھی زیادہ بعض حصے ایسے ہیں جن کا پردہ غریبوں کے لئے ناممکن ہے تو پھر اگر اسی قدر حصہ یعنی مرد کا ڈھکا ہوا جسم اور اس کی حرکات عورت کو نظر آتی ہیں تو یہ امر اس کے لئے ناجائز کیونکر ہو گیا؟

پردہ مرد اور عورت کے لئے برابر ہے جیسے عورت کے لئے پردہ ہے ایسے ہی مرد کے لئے۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ پردہ صرف عورت کے لئے ہے پردہ کے مسئلہ کو عقل کی روشنی میں مسائل کی چھان بین کرنے والے لوگوں کے لئے لَا یَنْحَلّ عُقْدَہ بنا دیا ہے۔ اگر عورت کو چادر اوڑھ کر باہر نکلنے کا حکم دیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ پردہ کا حکم صرف اسی کے لئے ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد کا اصل دائرہ عمل گھر سے باہر ہے اور عورت کا اصل دائرہ عمل گھر کی چار دیواری ہے۔ پس چونکہ عورت مرد کے اصل دائرہ عمل میں جاتی ہے وہ چادر اوڑھ لیتی ہے اور مرد چونکہ اپنے اصل دائرہ عمل میں ہوتا ہے وہ کُھلا پھرتا ہے اگر اس کو اپنے دائرہ عمل میں چادر اوڑھنے کا حکم دیا جاتا تو چونکہ اس کا وہاں ہر وقت کا کام ہے اس کے لئے کام مشکل ہو جاتا اور وہ تھوڑے ہی

دنوں میں اپنے مرتبہ عمل سے گر جاتا جس طرح کہ اگر عورت کو اس کے دائرہ عمل یعنی گھر کی چار دیواری میں چادر اوڑھ کر کام کرنے کا حکم دیا جائے تو وہ گھبرا جائے اور کام نہ کر سکے۔ اس فرق کے مقابلہ میں مرد کو یہ حکم ہے کہ وہ عورت کے دائرہ عمل میں بالکل گھسے ہی نہیں اور اس کو آزادی سے اپنا کام کرنے دے پس حکم برابر ہے عورت اگر مرد کے دائرہ عمل میں گھستی ہے تو اس کے لئے حکم ہے کہ چادر اوڑھ لے اور مرد اگر عورت کے دائرہ عمل میں جانا چاہتا ہے تو اسے حکم ہے کہ بِلا عورت کی اجازت کے ایسا نہ کرے اور مرد کے لئے یہ سختی بھی عورت کی رعایت کے طور پر نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ مرد کے دائرہ عمل میں عورت کے بھی حقوق ہیں اور عورت کے دائرہ عمل سے مرد کے حقوق وابستہ نہیں۔ پس عورت کو اجازت کی ضرورت نہیں رکھی بلکہ صرف اوٹ کر لینا کافی رکھا ہے اور عورت کے دائرہ عمل میں مرد کے بِلا اجازت داخلہ کو روک دیا ہے۔

پردہ کے مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد حضرت عائشہ کے واقعہ کو سمجھ لینا کچھ بھی مشکل نہیں۔ حضرت عائشہ رسول کریم ﷺ کی اوٹ میں کھڑے ہو کر ان فوجی کرتبوں کو دیکھ رہی تھیں جن کو مصنّف ہفوات اپنی نادانی سے ناچ گھروں کے ناچ سے تشبیہہ دیتا ہے پس ان کا چہرہ تو اوٹ میں تھا اور وہ لوگ جو کرتب کر رہے تھے ہاتھوں سے یہ کام کر رہے تھے ان کے چہرہ پر نظر ڈالے بغیر اور آنکھ سے آنکھ مِلائے بغیر آپ ان کے فنون کو دیکھ سکتی تھیں پس یہ بھی شریعت کے خلاف بات نہ تھی اس طرح ضروری اور علمی امور کو دیکھنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ جیسا میں پہلے ثابت کر آیا ہوں ضروری ہے۔

حضرت فاطمہ کی نسبت روایات شیعہ اور سنی سے ثابت ہے کہ وہ بھی گھر سے باہر نکلتی تھیں اور رسول کریم ﷺ کے پاس بھی تشریف لاتی تھیں اور حضرت ابوبکر سے فدک کا مطالبہ کرنے بھی تشریف لے گئی تھیں اور کہیں تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا کہ اس وقت قناتیں کھینچ کر پردہ کر دیا جاتا تھا یا یہ کہ مردوں کو راستہ چلنے سے روک دیا جاتا تھا ایسے اوقات میں لازماً ان کی نظر بھی گلیوں میں چلنے والے مردوں کے بعض حصص پر پڑتی ہوگی جس طرح کہ گلیوں میں چلنے والے مردوں کی نظر آپ کے ایسے حصص پر جو چھپائے نہیں جاسکتے پڑتی تھی۔ پس جو امور کہ خود ان لوگوں سے سرزد ہوتے رہے ہیں جن کو کہ آپ لوگ بھی بزرگ سمجھتے ہیں ان پر اعتراض کرنا حد درجہ کی ڈھٹائی نہیں تو اور کیا ہے؟ حضرت عائشہؓ کا صرف اس قدر قصور ہے کہ جس بات کو بہت سے لوگ اپنی منافقت کے پردہ میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں حضرت عائشہؓ اس کو مؤمنانہ

سادگی سے بیان کر دیتی تھیں اور یہ قصور عقلمندوں کے نزدیک قصور نہیں بلکہ قابل فخر جرأت ہے۔

حضرت علی کی محبت میں رسول کریمؐ کا انحراف حق سے ایک اعتراض

مصنف ہفوات نے یہ کیا ہے کہ تاریخ بغداد اور شرح نہج البلاغہ معتزلی میں لکھا ہے کہ عبد اللہ بن عباس روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر کے پاس ایک دفعہ ایک صاع کھجور کا ٹوکرا پڑا تھا اور آپ اس میں سے کھا رہے تھے میں جو گیا تو مجھے بھی کہا کہ کھاؤ میں نے ایک کھجور اٹھائی اور حضرت عمر نے سب کھجوریں کھالیں اور ایک ٹھلیا پانی کی پی اور بار بار شکر خدا کا کرنے لگے۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو؟ میں نے کہا مسجد سے۔ حضرت عمر نے پوچھا تمہارے عمزاد برادر کیا کرتے ہیں؟ میں نے کہا اپنے ہم سنوں میں کھیلتے ہوں گے (یعنی عبد اللہ بن جعفر) انہوں نے کہا نہیں میں تمہارے بزرگ اہل بیت (یعنی علی) کا پوچھتا ہوں؟ میں نے کہا وہ ایک باغ میں اُجرت پر پانی بھرنے جاتے ہیں اور قرآن کی تلاوت کرتے جاتے ہیں۔

اس کے آگے مصنف ہفوات نے ان کتب کی عربی عبارت یوں درج کی ہے۔ قَالَ یَا عَبْدَاللّٰہِ عَلَیْکَ دِمَاءُ الْبُدْنِ اِنْ کَتَمْتَھَا ھَلْ بَقِیَ فِیْ نَفْسِہٖ شَیْئٌ مِنْ اَمْرِ الْخِلَافَۃِ قُلْتُ نَعَمْ وَاَزِیْدُکَ سَئَلْتُ اَبِیْ عَمَّا یَدَّعِیْہِ فَقَالَ صَدَقَ فَقَالَ عُمَرُ لَقَدْ کَانَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ مِنْ اَمْرِ ذَرْوٍ مِنْ قَوْلٍ لَا یُثْبِتُ حُجَّۃً وَلَا یَقْطَعُ عُذْرًا وَلَقَدْ کَانَ یَرْبَعُ فِیْ اَمْرِہٖ وَقْتًا مَا وَلَقَدْ اَرَادَ فِیْ مَرَضِہٖ اَنْ یُّصَرِّحَ بِاسْمِہٖ فَمَنَعْتُ مِنْ ذٰلِکَ اِشْفَاقًا وَحِیْطَۃً عَلَی الْاِسْلَامِ وَرَبِّ ھٰذِہِ الْبَیْتِ لَا تَجْتَمِعُ عَلَیْہِ قُرَیْشٌ اَبَدًا وَلَوْ وَلِیَھَا لَا انْتَقَضَتْ عَلَیْہِ الْعَرَبُ مِنْ اَقْطَارِھَا فَعَلِمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ اَنِّیْ عَلِمْتُ مَا فِیْ نَفْسِہٖ فَاَمْسَکَ وَاَبَی اللّٰہُ اِلَّا اِمْضَاءُ مَا حَتَمَ۔ [۱۰۵] اس کا ترجمہ۔ ان کے اپنے الفاظ میں یوں ہے۔

حضرت عمر نے فرمایا اے عبد اللہ تم پر اونٹوں کی قربانی فرض ہو جائے جو تم چھپاؤ۔ سچ کہو کیا علی کے دل میں اب بھی ادعائے خلافت ہے؟ میں نے کہا ہاں بلکہ میں اس سے زیادہ بتاؤں کہ میں نے اپنے باپ سے بھی یہ بات دریافت کی تو انہوں نے فرمایا کہ علی کا دعویٰ سچا ہے۔ حضرت عمر نے کہا کہ آنحضرت سے علی کے باب میں چند بار ایسے کلمات نکلے ہیں کہ وہ ثابت نہیں ہوتے اور نہ ان سے حجت قطع ہوتی ہے اس محبت کے سبب سے جو ان کو علی سے تھی اور آنحضرت نے اپنے مرض موت میں حق سے باطل کی طرف میل کرنا چاہا تھا کہ نام علی کی صراحت کر دیں لیکن خدا کی قسم میں

نے شفقت امت اور محبت اسلام کے سبب سے آنحضرت کو منع کیا کیونکہ قریش خلافت علی پر اتفاق نہ کرتے اگر وہ خلیفہ ہو جاتے تو اطراف عرب میں (یعنی مہاجرین قریش) شورش کرتے۔ پس آنحضرت نے جان لیا کہ میں اس بھید کو سمجھ گیا جو بات آنحضرت کے دل میں تھی بایں وجہ آنحضرت ساکت ہو گئے اور نام علی کی صراحت نہ کر سکے اور اللہ تعالیٰ کو جو منظور تھا وہ حکم جاری ہوا۔

اور اس سے نتیجہ یہ نکالا ہے کہ (۱) کیا رسول خدا علی کی محبت میں ایسے گرفتار تھے کہ معاذاللہ حق سے باطل کی طرف میل کر جاتے تھے (۲) اور ایسے کوتہ عقل (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ) کہ جو حضرت عمر کو سوجھتی تھی وہ رسول اللہ کو نہ سوجھتی تھی (۳) پھر حضرت عمر کو تو رسول اللہ اور آپ کی امت پر شفقت مگر خود رسول اللہ کو اپنی امت پر شفقت نہ ہو (۴) حضرت عمر کو گستاخ و بے ادب ثابت کر کے ان کے ایمان کی نفی کی گئی ہے۔

پیشتر اس کے کہ میں ان اعتراضات کا جواب دوں۔ اول تو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ترجمہ میں صاحب مصنّف نے خیانت سے کام لیا ہے پہلی خیانت تو یہ ہے کہ لَقَدْ کَانَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ مِنْ اَمْرِ ذَرْوٍ مِنْ قَوْلٍ لَا یُثْبِتُ حُجَّۃً کا ترجمہ مصنّف نے یہ کیا ہے کہ آنحضرت سے علی کے باب میں چند بار ایسے کلمات نکلے ہیں کہ وہ ثابت نہیں ہوتے جس کے یہ معنے بنتے ہیں کہ گو رسول کریم ﷺ نے حضرت علی کے حق میں بعض باتیں فرمائی ہیں لیکن وہ غلط ہیں حالانکہ اصل عبارت کے یہ معنے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی طرف سے ایسی باتیں بیان کی جاتی ہیں جو محض اشارات کہی جا سکتی ہیں یا عبارتوں کے ٹکڑے ہیں لیکن ان سے دلیل نہیں پکڑی جا سکتی کیونکہ وہ باتیں واضح نہیں ہیں۔ ذَرْوٍ مِّنْ قَوْلٍ کے معنے یا حصہ کلام یا اشارہ کے ہوتے ہیں اسی طرح لَا یُثْبِتُ حُجَّۃً کے معنے نہیں کہ وہ کلمات غلط ہیں بلکہ یہ کہ وہ ایسے واضح نہیں ہیں کہ ان سے دلیل پکڑی جا سکے۔

دوسری خیانت مصنّف کی یہ ہے کہ انہوں نے وَلَوْ وَلِیَهَا لَانْتَقَضَتْ عَلَیْهِ الْعَرَبُ مِنْ اَطْرَافِهَا کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اگر وہ خلیفہ ہو جاتے تو اطراف عرب میں (یعنی مہاجرین قریش) شورش کرتے۔ گویا حضرت عمر نے یہ فرمایا تھا کہ اگر علی کو رسول کریم ﷺ خلیفہ مقرر کر دیتے تو مہاجرین ان کا مقابلہ کرتے اور سارے عرب میں شور ڈال دیتے۔ حالانکہ یہ ترجمہ بالکل غلط ہے۔ اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے کہ اگر علی خلیفہ ہو جائیں تو عرب لوگ چاروں طرف سے ان کی مخالفت شروع کر دیں گے اور اس میں مہاجرین کی مخالفت یا ان کی شورش کا اشارہ بھی نہیں۔ اگر کہا جائے

کہ عرب میں مہاجرین بھی شامل تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس طرح عرب کے لفظ کے عام معنی کرنے ہیں تو پھر عرب میں حضرت علی کے اپنے رشتہ دار بھی اور تمام بنو ہاشم اور بنو مُطّلب بھی شامل تھے مگر یہ کوئی نہیں کہتا کہ اس بات کا یہ مطلب تھا کہ حضرت عباس اور عقیل بھی حضرت علی کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہو جائیں گے۔

مصنّف کے ترجمہ کی ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کر کے جو اپنی وضع سے بتا رہی ہیں کہ جان بوجھ کر اپنے مضمون کو زور دار بنانے کے لئے کی گئی ہیں اب میں اس حدیث کی حقیقت پر روشنی ڈالتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس حدیث کے بعض حصے نہایت قابل اعتراض ہیں اور اگر وہ ثابت ہوں تو حضرت عمر پر اعتراض آتا ہے اور اگر نہ ثابت ہوں تو حدیث جھوٹی قرار پاتی ہے میں اس امر میں مصنّف ہفوات سے بالکل متفق ہوں کہ یہ حدیث بالکل جھوٹی ہے لیکن اس کا اثر علمائے اہل سنت پر کچھ نہیں پڑتا کیونکہ یہ حدیث اہل سنت کی کتب معتبرہ میں سے نہیں ہے بلکہ اس کا اول راوی ایک ایسا شخص ہے جو گو نہ سنی کہلا سکے اور نہ شیعہ مگر اس کی طبیعت کا اصل رجحان شیعیت کی طرف ہے۔ پس اول تو جیسا کہ میں ثابت کر چکا ہوں بعض حدیثوں کے جھوٹا ثابت ہونے سے نہ علم حدیث پر اور نہ علمائے اہل سنت پر کوئی حرف آسکتا ہے۔ دوم یہ حدیث اہل سنت کی کتب سے نہیں شروع ہوئی اس کی ابتداء ان لوگوں سے شروع ہوئی ہے جو شیعیت کی طرف راجح ہیں۔ پس اگر اس سے کسی پر الزام لگ سکتا ہے تو شیعوں پر۔ سوم میں جہاں تک سمجھتا ہوں یہ حدیث ان بعض شیعوں کی بنائی ہوئی ہے جو جھوٹ کو اپنی تائید کے لئے جائز سمجھتے ہیں اور تقیہ کو دین کا ایک جزو قرار دیتے ہیں۔ اور مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ احادیث پر ایک مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہل شیعہ نے ظلماً اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جھوٹی حدیثیں اہل سنت سے بیان کی ہیں تاکہ ان کی کتب سے اپنے مطلب کی روایات پیش کر سکیں۔ ایسی کئی حدیثیں ہیں جن کو درایتاً اور روایتاً انسان جھوٹا ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے اور پھر ساتھ ہی اس کو یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ یہ اہل سنت کی بنائی ہوئی نہیں ہیں بلکہ اہل شیعہ کی ہیں۔

میرا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ اہل سنت لوگوں میں ایسا کوئی شخص نہیں گزرا جس نے جھوٹی حدیث بنائی ہو یا یہ کہ شیعہ لوگ مذہباً جھوٹ بولتے ہیں۔ حَاشَا وَ کَلَّا اس سے زیادہ میرے ذہن سے اور کوئی بات دور نہیں ہو سکتی۔ میں طبعاً اور اخلاقاً اور علماً اور مذہباً اس امر کا مخالف ہوں کہ کسی قوم کو محض اختلاف عقائد کی وجہ سے ایسا سمجھ لیا جائے کہ اس میں گویا اخلاقی طور پر کوئی نیک

ہی نہیں۔ میرے نزدیک شیعوں میں بھی سچ بولنے والے موجود ہیں جس طرح کہ ہندوؤں اور مسیحیوں اور یہودیوں اور سکھوں اور اہل سنت میں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس قوم میں روحانیت زیادہ ہو گی اس کے زیادہ افراد بااخلاق ہوں گے اور اس کا معیار اخلاق بھی بالا ہو گا لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دنیا کی ہر قوم میں ایسے لوگ موجود ملیں گے جو ایک حد تک اخلاق کے پابند ہوں گے اور بڑی بڑی بدخُلقیوں سے پاک ہوں گے۔ اسی طرح خواہ کوئی مذہب کتنا ہی تصرف اپنے پیروؤں پر رکھتا ہو اس کے پیروؤں میں ایسے لوگ ضرور پائے جائیں گے جو بداخلاقیوں کے مرتکب ہوں گے اور انسانیت کا جامہ پھاڑ چکے ہوں گے۔ پس میں بوضاحت بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں ہرگز کسی قوم کو جو میرے ساتھ مذہباً اختلاف رکھتی ہو اخلاق سے عاری نہیں سمجھتا اور نہ خیال رکھتا ہوں کہ جو لوگ میرے ہم خیال یا ہم مذہب ہیں وہ تمام کے تمام بِلا استثناء بدیوں اور گناہوں سے پاک ہیں اور ان میں کوئی بھی بدخُلقی نہیں پائی جاتی مگر میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ اگر کسی قوم میں یہ عقیدہ ہو کہ انسان اپنے عقیدہ اور یقین کے خلاف ضرورت وقت کو مدنظر رکھ کر بیان کر سکتا ہے اور عمل پیرا ہو سکتا ہے وہ قوم بہت زیادہ اس خطرہ میں ہے کہ اس کے کمزور اور ضعیف الاخلاق لوگ جھوٹ اور فریب کی مرض میں مبتلاء ہو جائیں اور میں سمجھتا ہوں کہ بعض اہل شیعہ نے اس قسم کا عقیدہ ایجاد کر کے اپنے ہم مذہبوں پر ایک اخلاقی ظلم کیا ہے اور دوست بن کر دشمنوں کا کام کیا ہے۔

مگر میں فطرت انسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے کہتا ہوں کہ اکثر اہل شیعہ یقیناً اس خیال سے نفرت رکھتے ہوں گے اور ائمہ اہل بیت کو اس ناپاک خیال سے پاک سمجھتے ہوں گے اور اس گند کو ان کی طرف منسوب نہیں کرتے ہوں گے بلکہ یقین رکھتے ہوں گے کہ بعض نادان لوگوں نے یہ باتیں بعد میں گھڑی ہیں نہ تو ائمہ اہل بیت نہ کبار شیعہ اس جرم کے مرتکب ہو سکتے ہیں مگر بہرحال چونکہ بعض لوگوں نے اس قسم کا عقیدہ گھڑا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اہل شیعہ میں سے اہل سنت کی نسبت بہت زیادہ لوگوں کو جھوٹی حدیثیں بنانے کا موقع مل گیا ہے اور ان میں سے بعض نے افسوس سے کہنا چاہئے کہ اہل سنت کا جامہ پہن کر شیعیت کے عقائد کو پردے پردے میں اہل سنت کی روایات میں داخل کرنا چاہا ہے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ ائمہ اہل حدیث کا طریق یہ تھا کہ وہ احادیث کے لئے ایک خاص معیار مقرر کر کے جو حدیث اس معیار کے مطابق ان کو پہنچتی تھی وہ اسے روایت کر دیتے تھے۔ گو ان

میں سے بعض جھوٹی بھی ہوں۔ اور جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں ان کا یہ طریق نہایت عمدہ اور دُور اندیشی پر مبنی تھا پس اگر اس حدیث کے راوی کو گو یہ صحاح میں یا معتبر کتب حدیث میں درج نہیں دیانتدار قرار دیا جائے تو اس کی نسبت یہی کہا جائے گا کہ اس نے اپنے مقرر کردہ معیار پر اس حدیث کو صحیح پا کر اسے اپنی کتاب میں درج کر دیا۔ گو ممکن ہے کہ وہ خود بھی اسے جھوٹا سمجھتا ہو۔ اور جیسا کہ قوی قرائن سے ثابت ہے یہ کسی ایسے ہی شیعہ کی بنائی ہوئی ہے جس نے اپنے مذہب کو چھپا کر اپنے عقیدہ کی اشاعت کے لئے جھوٹ کو اپنا شیوہ بنایا ہوا ہو۔

میں اپنے اس خیال کی تائید میں مندرجہ ذیل شہادت پیش کرتا ہوں (۱) یہ حدیث جیسا کہ خود اس کی عبارتوں سے ثابت ہے جھوٹی ہے (۲) جب یہ جھوٹی ہے تو اس کو بنانے والا وہی ہو سکتا ہے جس کو اس حدیث کے مضمون سے فائدہ پہنچ سکتا ہو اور (۳) یہ فائدہ ایک شیعہ کو ہی پہنچ سکتا ہے (۴) پس یہ کسی اہل شیعہ کی بنائی ہوئی ہے۔

اس امر کا ثبوت کہ یہ روایت محض جھوٹی اور بناوٹی ہے مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ اس روایت کی بنیاد اس امر پر ہے کہ حضرت علیؓ کو خواہش خلافت تھی اور وہ اپنے آپ کو اس کا حق دار سمجھتے تھے حتیٰ کہ حضرت عمر کے وقت تک اس کا اظہار کرتے رہتے تھے اور یہ امر روایتاً و درایتاً بالکل باطل ہے پس معلوم ہوا کہ یہ روایت بالکل جھوٹی ہے کیونکہ واقعات کے برخلاف ہے۔

درایتاً تو یہ امر اس لئے غلط ہے کہ یہ خیال کر لینا کہ حضرت علیؓ جیسا بہادر اور شجاع انسان ایک امر کو حق سمجھ کر پھر اس پر خاموش رہے اور رسول کریم ﷺ کی وصیت کو پس پشت ڈال دے اور عالم اسلام کو تباہ ہونے دے بالکل عقل کے خلاف ہے۔ یہ امر ثابت ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابو بکرؓ کی بھی بیعت کی اور پھر حضرت عمرؓ کی بھی بیعت کی اور پھر ان کے ساتھ مل کر کام کرتے رہے ایسا ایک شخص جو دوسرے کی غلامی کا جوا اپنی گردن پر رکھ لیتا ہے اور اس کی بیعت میں شامل ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے اس کی نسبت یہ خیال کرنا کہ وہ دل میں نیابت کو اپنا حق سمجھتا تھا اور حق بھی لیاقت کی وجہ سے نہیں بلکہ منشائے شریعت کے ماتحت۔ اس کے معنے دوسرے الفاظ میں یہ ہیں کہ وہ شخص اول درجہ کا منافق تھا اور یہ بات حضرت علیؓ کی نسبت امکانی طور پر ذہن میں لانی بھی گناہ معلوم ہوتی ہے کُجا یہ کہ اس کے وقوع پر یقین کیا جائے۔ پس حضرت علیؓ کا طریق عمل اس خیال کو باطل کر رہا ہے اور جب کہ عقل اس امر کو تسلیم نہیں کر

سکتی کہ حضرت علی ظاہر میں حضرت عمر کے دوست بنے ہوئے ہوں اور ان کی بیعت میں ہوں اور دل میں یہ خیال کرتے ہوں کہ خدا اور اس کے رسول کے حکم کے ماتحت وہ خلیفہ ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ یہ روایت عقل کے خلاف ہونے کے سبب بناوٹی اور جھوٹی ہے۔

دوسری بات جو اس کو بالبداہت باطل ثابت کرتی ہے یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی لڑکی کی شادی حضرت عمر سے کی ہے۔ اب کون سا شخص ہے جو حضرت علیؓ کو ایک اعلیٰ درجہ کا ولی تو الگ رہا ایک غیور مسلمان سمجھتے ہوئے بھی یہ خیال کر سکے گا کہ انہوں نے اپنی لڑکی ایک منافق کو دے دی حالانکہ قرآن کریم میں رشتہ ناطہ کے تعلقات میں سب سے زیادہ زور تقویٰ پر دیا ہے۔ اگر حضرت علی جیسا انسان خوف سے یا لالچ سے اپنی لڑکی ایک منافق کو دے سکتا ہے تو ایمان کا ٹھکانا کہیں نہیں رہتا اور اسلام ایک موہوم بات ہو جاتا ہے۔ پس حضرت علی کا حضرت عمر کو اپنی لڑکی بیاہ دینا اس امر پر شاہد ہے کہ وہ ان کو غاصب اور منافق خیال نہیں کرتے تھے بلکہ ایک سچا متقی اور حق دار خلافت سمجھتے تھے۔ میں تو حیران ہوتا ہوں کہ وہ لوگ جو خیال کرتے ہیں کہ حضرت علی حضرت عمر کو منافق سمجھتے تھے کس طرح خوارج کو اس بات کے کہنے کا موقع دیتے ہیں کہ حضرت علی نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ خلافت کی خواہش میں ایسے مخمور تھے کہ انہوں نے اپنی بے گناہ لڑکی، حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی ایک منافق اور بے دین شخص کو جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کی وصیت کے خلاف خلافت اور نیابت کے حق کو غصب کر کے دین کی بربادی اور تباہی میں مشغول تھا دیدی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ [۱۰۶] مصنف صاحب ہفوات کو اگر اس نکاح میں شبہ ہو تو وہ شیعہ کتب مثلاً کلینی وغیرہ دیکھیں انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کتب اہل شیعہ میں بھی اس نکاح کا ذکر ہے گو ایسے الفاظ میں ہے کہ شریف آدمی رسول کریم ﷺ کے خاندان کے متعلق انہیں استعمال نہیں کر سکتا۔

درایت کے علاوہ تاریخی طور پر بھی ایسے ثبوت ملتے ہیں کہ جو اس بات کو باطل قرار دیتے ہیں کہ حضرت علی دل میں خواہش خلافت رکھتے تھے یا یہ کہ حضرت عمر کو ان پر شبہ تھا۔ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت عمر نے اپنے زمانہ خلافت میں بعض سفروں کے پیش آنے پر حضرت علی کو اپنی جگہ مدینہ کا امیر مقرر فرمایا تھا۔ چنانچہ تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ واقعہ جسر کے موقع پر جو مسلمانوں کو ایرانی فوجوں کے مقابلہ پر ایک قسم کی زک اٹھانی پڑی تو حضرت عمر نے لوگوں کے مشورہ سے ارادہ کیا کہ آپ خود اسلامی فوج کے ساتھ ایران کی سرحد پر تشریف لے جائیں تو آپ

نے اپنے پیچھے حضرت علی کو مدینہ کا گورنر مقرر کیا[۷ ؎] اب ہر اک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اگر حضرت علی پر حضرت عمر کو ذرا بھی شبہ ہوتا جیسا کہ اوپر کی روایت کے راوی نے ثابت کرنا چاہا ہے تو پھر وہ اپنی غیبت کے دنوں میں ان کو دارالخلافہ مدینہ کا گورنر کیوں مقرر کرتے؟ کیا ایسے شخص کو جس پر بدظنی ہوتی ہے کوئی عقلمند صدر مقام کا بااختیار حاکم بنا سکتا ہے؟ وہ ضرور خوف کرتا ہے کہ ایسا نہ ہو میرے جانے کے بعد ملک میں بغاوت کر کے یہ شخص حکومت پر قابض نہ ہو جائے پس اگر فی الواقع حضرت عمر کو حضرت علی پر کوئی شبہ ہوتا تو کسی صورت میں بھی آپ ان کو اپنی غیبت کے ایام میں مدینہ کا گورنر نہ مقرر کرتے۔ اگر کوئی شیعہ صاحب یہ کہیں کہ اس سفر میں تو حضرت عمر چار پانچ دن کے بعد ہی واپس آگئے تھے اور لشکر کی کمان حضرت سعد بن ابی وقاص کو سپرد کر دی تھی تو انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ اس کے بعد جب بیت المقدس کا محاصرہ مسلمانوں نے کیا ہے اور وہاں کے لوگوں نے اس وقت تک ہتھیار ڈالنے سے انکار کیا ہے جب تک کہ خود حضرت عمر وہاں تشریف نہ لائیں تو اس وقت بھی حضرت عمر حضرت علی کو ہی اپنے بعد مدینہ کا گورنر مقرر کر گئے تھے[۸ ؎] حالانکہ آپ کو کئی ماہ کا سفر پیش تھا جس میں دشمن کچھ کا کچھ کر سکتا ہے۔ پس اگر یہ درست ہے کہ حضرت عمر کو حضرت علی پر شک تھا یا ان کے حضرت علی سے تعلقات اچھے نہ تھے تو کب ممکن تھا کہ وہ انہیں مدینہ جیسے اہم مقام کا جو تمام فوجی طاقت کی کنجی تھی والی مقرر کر جاتے۔ اگر فی الواقع ان کے دل میں کوئی شک ہوتا تو وہ ضرور انہیں اپنے ساتھ لے جاتے تاکہ وہ ان کے پیچھے کوئی فتنہ نہ کھڑا کر دیں۔ اب ایک طرف تو حضرت عمر کا فعل ہے کہ آپ دو دفعہ حضرت علی کو اپنے بعد مدینہ کا گورنر مقرر کرتے ہیں اور ان پر اس انتہائی درجہ کے اعتماد کا ثبوت دیتے ہیں جو ایک بادشاہ اپنی رعایا کے متعلق رکھ سکتا ہے دوسری طرف مذکورہ بالا روایت ہے کہ حضرت عمر کو حضرت علی پر شک رہتا تھا کہ شاید خلافت کے حصول کا خیال اب تک ان کے دل میں باقی ہے ان دونوں چیزوں میں ہم کسے ترجیح دیں؟ حضرت عمر کی فعلی شہادت کو یا ایک راوی کی روایت کو جس کی روایات فتنہ پردازی میں خاص شہرت رکھتی ہیں۔ پس مندرجہ بالا واقعات سے درایتاً و روایتاً دونوں طرح روز روشن کی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت علی کو حضرت عمر سے کچھ پرخاش نہ تھی اور نہ حضرت عمر کو ان پر کسی قسم کی بدظنی تھی اور اوپر کی روایت محض جھوٹ اور افتراء ہے۔

دوسرا ثبوت اس روایت کے جھوٹے ہونے کا خود اس کی اپنی عبارت ہے اس میں لکھا ہے کہ حضرت علی حضرت عمر کے زمانہ میں اُجرت پر پانی بھرنے جایا کرتے تھے حالانکہ ایک بچہ بھی جانتا

ہے کہ حضرت عمر نے اپنے زمانہ خلافت میں تمام اہل بیت کے بیش بہا وظائف مقرر کر چھوڑے تھے اور حضرت علی کو حسنین کے وظائف ملا کر کوئی پندرہ بیس ہزار سالانہ مل جاتا تھا۔ اب ایسے شخص کی نسبت جس کی آمد پندرہ بیس ہزار روپیہ سالانہ ہو۔ یہ کہنا کہ وہ کسی کے باغ میں پانی بھر کے روٹی کمایا کرتا تھا کس قدر خلاف عقل ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ کسی شخص نے جسے علم تاریخ سے کوئی لگاؤ نہ تھا آنحضرت ﷺ کے زمانہ کے بعض حالات سن کر جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کسب حلال کے لئے مزدوری کر لیا کرتے تھے اس حدیث میں یہ بات بھی درج کر دی ہے اور یہ خیال نہیں کیا کہ حضرت عمر کے زمانہ میں مسلمانوں کی حالت اور تھی اور رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں اور۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ روایت جھوٹی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ کسی ایسے ہی شخص نے بنائی ہے جسے اس حدیث سے فائدہ پہنچتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا فائدہ سنیوں کو نہیں پہنچتا ہے بلکہ اس حدیث میں حضرت عمر پر اعتراض کیا گیا ہے اس لئے سنّی جان بوجھ کر ایسی حدیث ہرگز نہیں بنا سکتا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس حدیث سے کس قوم کو فائدہ پہنچتا ہے؟ سو ظاہر ہے کہ اس حدیث سے شیعوں کو کئی طرح فائدہ پہنچتا ہے۔ اول اس میں حضرت عمر پر ہنسی اڑائی گئی ہے کہ آپ ایک ٹوکرا کھجوروں کا کھا گئے۔ اور ایک ٹھلیا پانی کا پی گئے۔ دوم حضرت علی کی مظلومیت بتائی گئی ہے کہ جب کہ تمام مسلمانوں کے گھر دولت سے بھر رہے تھے اور ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کا بھی چار ہزار درہم سالانہ مقرر تھا آپ کو کوئی نہیں پوچھتا تھا اور آپ لوگوں کے کھیتوں پر پانی بھر بھر کر گزارہ کیا کرتے تھے۔ تیسرے یہ بتایا گیا ہے کہ جب کہ حضرت عمر ٹوکرے بھر بھر کر کھجوریں کھاتے اور غیبت میں مشغول رہتے حضرت علی مزدوری کرتے اور تلاوت قرآن میں مشغول رہتے۔ چوتھے یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت عباس بھی حضرت علی کے دعوئے خلافت کے مؤید تھے۔ اب ہر اک شخص جو تعصب سے خالی ہو اسے تسلیم کرے گا کہ ان سب باتوں کا فائدہ شیعہ صاحبان کو ہی پہنچتا ہے اور انہی کے عقائد اور دعووں کی اس میں تصدیق ہوتی ہے۔ پس جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ حدیث روایتاً اور درایتاً جھوٹی ثابت ہوتی ہے تو اس امر کے ثابت ہو جانے پر کہ اس حدیث کے مضمون کا فائدہ شیعہ صاحبان کو ہی پہنچتا ہے کس عقل مند کو اس بات کے تسلیم کرنے میں شبہ ہو سکتا ہے کہ اس حدیث کا بنانے والا کوئی دھوکا خوردہ شیعہ تھا جس نے مذہب کی حقیقت کو نہ سمجھتے ہوئے سچ کی تائید کے لئے ہر ایک تدبیر کا اختیار کرنا جائز ہے کے شرمناک مسئلہ پر عمل کیا ہے۔ پس مصنّف

صاحب ہفوات کو سُنیوں کے بزرگوں کو گالیاں دینے کا حق نہیں انہیں اپنے ہی بھائی بندوں کو کوسنا چاہئے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ باوجود اس کے کہ اس حدیث کا جھوٹا ہونا روز روشن کی طرح ثابت ہے۔ میرے نزدیک اس کا اِحراق اور اِحکاک جائز نہیں کیونکہ جیسا کہ میں شروع میں ثابت کر چکا ہوں کسی کا حق نہیں کہ کسی مصنّف کی تصنیف میں اپنی مرضی کے مطابق کوئی تغیّر کر دے۔ اگر مصنّف صاحب ہفوات فرمائیں کہ جب حدیث جھوٹی ثابت ہو گئی تو اس کے رکھنے کا کیا فائدہ؟ مگر میں کہتا ہوں کہ فائدہ ہو نہ ہو تصنیف ایک امانت ہے اور اس میں تغیّر ایک خیانت ہے جو مسلمان کے لئے جائز نہیں۔ لیکن یہ بھی درست نہیں کہ ایسی حدیث کے رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اس میں فائدہ ہے۔ ایسی احادیث انسانی اخلاق کے اس تاریک پہلو پر روشنی ڈالتی رہتی ہیں کہ بعض لوگ اپنے خیال کی تائید میں خدا کے مقدس رسولوں پر جھوٹ باندھنے سے بھی پرہیز نہیں کرتے اور اس امر کے معلوم ہونے سے عقل مند انسان بہت سے گڑھوں سے بچ جاتا ہے۔

ردّ بہتان در سُبکی عقل رسول ﷺ و گستاخی حضرت عمرؓ ایک اعتراض

مصنّف صاحب ہفوات نے یہ کیا ہے کہ مسلم کتاب الایمان جلد اول میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ رسول کریم ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ کو اپنی جوتیاں دے کر کہا کہ جو شخص تم کو ملے اسے کہدو کہ جو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہے وہ جنت میں داخل ہو گا حضرت عمر سب سے پہلے ان کو ملے۔ ان کو حضرت ابو ہریرہ نے یہ بات پہنچائی تو انہوں نے ابو ہریرہ کے اس زور سے گھونسا مارا کہ وہ گر پڑے اور پھر فرمایا کہ واپس چلے جاؤ۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے پاس واپس آکر شکایت کی اتنے میں حضرت عمر بھی پہنچ گئے۔ رسول کریم ﷺ نے ان سے ابو ہریرہ کو مارنے کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ نے ان سے کہا تھا کہ اس طرح لوگوں کو کہدو؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ اس پر حضرت عمر نے کہا کہ ایسا نہ کیجئے ورنہ لوگ خدا تعالیٰ کی عبادت ترک کر دیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا جانے دو[۱۰۹]۔

مصنّف صاحب ہفوات نے اس حدیث پر یہ اعتراض کئے ہیں (۱) کیا صحابہ جھوٹ بولا کرتے تھے کہ رسول کریم ﷺ کو ابو ہریرہ کے ہاتھ میں اپنی جوتیاں دینی پڑیں تا کہ لوگ ان کو جھوٹا نہ سمجھیں؟ (۲) کیا حضرت عمر ایسے گستاخ تھے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کے ایلچی کو مارا؟

(۳) کیا رسول کریم ﷺ حضرت عمرؓ سے کمزور تھے کہ حضرت عمرؓ سے ڈر کر آپ نے پہلی بات کا اعلان نہ کرایا؟۔

مصنّف صاحب ہفوات نے خود مضمون حدیث کو صحیح تسلیم کیا ہے کیونکہ وہ اس کی تشریح کرتے ہیں کہ "مراد یہ ہے کہ سردست جو توحید خدا کا بھی اقرار کرے وہ داخل امن ہے اس کی جان و مال کو کوئی جو کھوں نہیں"۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کو نہ قرآن کریم کا علم ہے نہ تاریخ کا انہیں یہ معلوم نہیں کہ اسلام پر کوئی بھی ایسا زمانہ نہیں آیا کہ اس نے صرف توحید پر ایمان لانے کو موجب نجات قرار دیا ہو۔ قرآن کریم کی نہایت ہی ابتدائی سورتوں میں بھی ایمان اور عمل دونوں کو نجات کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ العلق جو سب سے پہلی سورۃ ہے جو رسول کریم ﷺ پر نازل ہوئی اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی ۔ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی [11] یعنی انسان سرکش ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کی مدد سے مستغنی سمجھتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہر ایک امر میں لوٹنا پڑتا ہے۔ کیا تجھے اس شخص کا حال معلوم ہے جو ایک بندہ کو جب وہ نماز پڑھتا ہے روکتا ہے۔ سورۃ شمس میں کہ وہ بھی مکیہ ہے فرماتا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا [11] جو شخص اپنے نفس کو پاک کرے گا وہ کامیاب ہو گا اور جو اسے روند ڈالے گا وہ ناکام و نامراد رہے گا۔ پھر سورۃ التین مکیہ میں فرماتا ہے اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ [۱۲] یعنی سب لوگ تباہ ہوں گے سوائے ان لوگوں کے کہ ایمان بھی لائیں اور نیک عمل بھی کریں انہیں لازوال بدلے ملیں گے۔ سورۃ قارعہ میں جو وہ بھی مکی سورۃ ہے فرماتا ہے فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ فَھُوَ فِیْ عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ فَاُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ [۱۳] جس کے نیک عمل زیادہ ہوں گے وہ تو پسندیدہ زندگی بسر کرے گا اور جس کے نیک عمل بدیوں سے کم ہوں گے اس کا مقام دوزخ ہو گا۔ ان آیات سے ثابت ہے کہ شروع سے اسلام ایمان اور اعمال کی اصلاح پر زور دیتا چلا آیا ہے۔ اور کسی وقت بھی اس نے یہ رخصت نہیں دی کہ صرف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پر ایمان لے آؤ۔ کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ کوئی زمانہ اسلام پر ایسا بھی آیا ہے تب بھی اس حدیث کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کیونکہ جیسا کہ تاریخ اسلام کے واقف لوگ جانتے ہیں حضرت ابو ہریرہؓ ہجرت کے بعد رسول کریم ﷺ کی وفات سے صرف ساڑھے تین سال پہلے ایمان لائے تھے یعنی صلح حدیبیہ

اور جنگ خیبر کے درمیان کے زمانہ میں۔ دوسرے جیسا کہ اس حدیث کے الفاظ سے بھی ظاہر ہے اور دوسری تاریخی شہادتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے یہ واقعہ رسول کریم ﷺ کی وفات سے صرف دو سال پہلے کا ہے جب کہ مدینہ پر بعض مسیحی قبائل کے حملہ کی افواہیں گرم تھیں ان ایام میں رسول کریم ﷺ کا ذرا بھی آنکھوں سے اوجھل ہونا مسلمانوں میں گھبراہٹ پیدا کر دیتا تھا۔ پس جو واقعہ کہ عرب کی فتح کے بعد اور مشرکوں کے مغلوب ہو جانے کے بعد ہوا ہے۔ اس کی نسبت یہ کہنا کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ سردست اتنا کافی ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ دو کس قدر حماقت اور بے وقوفی کی بات ہے۔ کیا اس قسم کی آسانیاں ابتداء میں دی جاتی ہیں یا آخر میں؟ پس اس حدیث کا وہ مطلب ہرگز نہیں جو مصنّف ہفوات نے سمجھا ہے۔ اور اسی غلط مطلب کا نتیجہ ہے کہ انہیں دَخَلَ الْجَنَّۃَ کا ترجمہ یہ کرنا پڑا ہے کہ وہ داخل امن ہے اس کی جان ومال کو کوئی جوکھوں نہیں۔ جنت کا یہ ترجمہ خود مصنّف ہفوات کی پریشانی پر دلالت کرتا ہے نعماء دنیوی کا نام تو بے شک جنت رکھا جا سکتا ہے لیکن یہ مضمون بیان کرنے کے لئے کہ ہم اسے کچھ نہیں کہیں گے جنت کے لفظ کا استعمال صرف انہی کے دماغ کی اختراع ہے۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ اس حدیث کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ جو صرف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہدے وہ جنت میں داخل ہو جائے گا نہ یہ مطلب کہ اسے ہم کچھ نہیں کہیں گے تو اب سوال یہ ہے کہ اس کا کیا مطلب تھا؟ سو یاد رکھنا چاہئے کہ ہر ایک تعلیم کا ایک مرکزی نکتہ ہوتا ہے اور اختصار کے لئے کبھی اس مرکزی نکتہ کو بیان کر دیا جاتا ہے اور مراد یہ ہوتی ہے کہ تمام تفصیلات اس کے اندر شامل ہیں اور یہی نکتہ تھا جسے سمجھانے کے لئے رسول کریم ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ کو بھیجا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تنہائی کے مقام پر توحید کے حقائق پر غور کرتے ہوئے رسول کریم ﷺ کو جوش پیدا ہوا ہے کہ میں ایک نئے رنگ میں امت کو توحید کے نکتہ مرکزی ہونے کی طرف توجہ دلاؤں اور اس کے لئے آپ نے یہ طریق اختیار کیا کہ ایک صحابی کو اس کا اعلان کرنے کے لئے مقرر کر دیا۔ حضرت عمر راستہ میں ملے تو آپ کو دو خیال پیدا ہوئے (۱) اگر اس پیغام کو محدود معنوں میں لیا جائے (جن معنوں میں کہ مصنّف ہفوات نے قلت تدبر کی وجہ سے لیا ہے) تو وہ درست نہیں رسول کریم ﷺ کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ صرف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنا کافی ہے جب کہ قرآن و تعلیم رسول کریم ﷺ ان معنوں کو رد کر رہے ہیں۔ پس ابو ہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کو سمجھنے میں غلطی لگی ہے اور ان کو روکنا ضروری ہے (۲) اگر اس کی بجائے اس کے عام معنے لئے

جائیں تو یہ درست ہے لیکن ممکن ہے کہ لوگ اس کے معنے غلطی سے کچھ اور لے لیں اور اسلام میں رخنہ اندازی کریں۔ چونکہ آپ جانتے تھے کہ جس نکتہ کو رسول کریم ﷺ سمجھانا چاہتے ہیں خاص لوگ اسے پہلے ہی آپ کی تعلیم کے اثر سے سمجھ چکے ہیں اور عوام ان الفاظ سے دھوکا کھا سکتے ہیں اس لئے آپ نے حضرت ابو ہریرہ کو روکا۔ حضرت ابو ہریرہ چونکہ اس باریک بینی سے حصہ نہ رکھتے تھے جس سے عمرؓ۔ انہوں نے نہ مانا اور اس پر حضرت عمر نے ان کو دھکا دے کر واپس کرنا چاہا اور وہ گر گئے ورنہ عقل اس امر کو باور نہیں کر سکتی کہ بغیر کچھ بات کہنے کے حضرت عمر نے ابو ہریرہ کو مارا ہو۔ غرض جب رسول کریم ﷺ کے پاس پہنچ کر آپ نے حقیقت کا اظہار کیا تو رسول کریم ﷺ نے آپ کی بات کو تسلیم کر لیا۔ اور آپ کا تسلیم کر لینا ہی بتاتا ہے کہ حضرت عمر کے خیال کو آپ نے صحیح سمجھا۔ باقی رہا یہ خیال کہ کیا رسول کریم ﷺ نے اس بات کا خیال نہ کیا جس کا حضرت عمر نے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ کا تعلق لوگوں سے اور قسم کا تھا اور حضرت عمر کا اور قسم کا۔ حضرت عمر چونکہ بے تکلفی سے لوگوں میں ملتے تھے آپ اس گروہ سے واقف تھے جو اپنی بے ایمانی یا عقل کی کمزوری کی وجہ سے رسول کریم ﷺ کی باتوں کو غلط رنگ دینے یا غلط طور پر سمجھنے کی مرض میں مبتلاء تھا۔ پس جب انہوں نے رسول کریم ﷺ کو ان لوگوں کی طرف توجہ دلائی کہ ایسے لوگ اس حدیث کو سن کر عمل ہی چھوڑ بیٹھیں گے تو آپ نے بھی ان لوگوں کو ٹھوکر سے بچانے کے لئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ حضرت عمر جیسے لوگ اس مسئلہ کو سمجھ ہی چکے ہیں پس یہ صداقت مسلمانوں میں سے مٹے گی نہیں اپنے حکم کو منسوخ کر دیا اور ان الفاظ میں اعلان کرانے کی ضرورت نہ سمجھی جن الفاظ میں اعلان کرنے کا حکم کہ اس سے پہلے آپ نے حضرت ابو ہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کو دیا تھا۔

غرض یہ حدیث ہرگز قابل اعتراض نہیں ہے اور اس پر اعتراض صرف جہالت سے پیدا ہوا ہے جو تدبر کرنے والے لوگ ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس حدیث سے بجائے اعتراض کے صحابہ کا درجہ عظیم ظاہر ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ (۱) وہ لوگ دین کے لئے غیرت رکھتے تھے اور رسول کریم ﷺ کے تعلیم کے مغز کی حفاظت پر بہت حریص تھے (۲) وہ لوگ آپ کے اشارات کو خوب سمجھتے تھے اور پیشتر اس کے کہ آپ بِالوضاحت کسی امر کو بیان کریں آپ کے کلام کی تمہیدات سے ہی آپ کے مطلب کو سمجھ جاتے تھے (۳) یہ کہ رسول کریم ﷺ کو ان لوگوں کے اخلاص پر پورا یقین تھا اور آپ ان کے مشوروں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ تعجب ہے کہ

مصنف ہفوات اپنی اندرونی کیفیت کی وجہ سے اس خیال کی طرف تو چلے گئے کہ حضرت عمر کی سمجھ میں جو بات آئی حضرت نبی کریم ﷺ کی سمجھ میں نہیں آئی مگر ادھر ذہن نہ گیا کہ حضرت عمر چونکہ رسول کریم ﷺ کا مفہوم اچھی طرح سمجھ گئے تھے اس لئے آپ نے اس اعلان کرانے کی ضرورت نہ سمجھی تا نااہل لوگ دھوکا نہ کھائیں۔

مصنف صاحب ہفوات نے اس جگہ اپنے بُغض کے اظہار کے لئے یہ طریق بھی اختیار کیا ہے کہ بزعم خود حضرت عمر کے چند عیوب بیان کر کے لکھے ہیں کہ کیا ایسا شخص رسول کریم کی بات کو رد کر سکتا تھا؟ میں جیسا کہ بتا چکا ہوں رسول کریم ﷺ کی بات کے رد کرنے کا اوپر کے واقعہ سے کوئی ثبوت ہی نہیں ملتا بلکہ آپ کی حقیقی تعلیم کے سمجھنے اور اس کی تصدیق کرنے کا علم ہوتا ہے۔ پس یہ تو سوال ہی نہیں۔ باقی رہا یہ کہ حضرت عمر حضرت رسول کریم ﷺ سے ڈرتے تھے یہ عیب کی بات نہیں، خوبی ہے۔ میں اس شیعہ کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ جو یہ کہے کہ حضرت علی رسول کریم ﷺ سے نہیں ڈرتے تھے۔ نبیوں سے ڈرنا عین ایمان کی علامت ہے اور صرف بے ایمان ہی اس جذبہ سے خالی ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ پر ایمان خوف و رجاء کے درمیان ہے اسی طرح نبیوں پر ایمان بھی خوف و محبت کے درمیان ہے۔ جب تک دونوں جذبات نہ پائے جائیں ایمان کامل ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ مصنف ہفوات اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے جو مثال پیش کرتے ہیں وہ حد درجہ کی کمزور اور بودی ہے وہ تفسیر حسینی اور ترمذی کے حوالہ سے اول تو یہ بیان کرتے ہیں کہ جو آیت حرمت شراب کے متعلق نازل ہوتی تھی وہ حضرت عمر اور معاذ کو خاص طور پر بُلا کر سنائی جاتی تھی۔ لیکن آپ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ اے خدا! حرمت شراب کے بارے میں اور واضح بیان نازل فرما۔ لیکن جب وہ نہ مانے تو پھر جو کچھ ہوا وہ بقول مصنف یہ تھا کہ حضرت عمر شراب سے باز نہ آئے اور آخر رسول کریم ﷺ نے ان کو مارا اور تب جا کر وہ باز آئے۔

مذکورہ بالا بیان میں مصنف ہفوات نے یہ اعتراض کئے ہیں۔ اول حضرت عمر شراب پیا کرتے تھے دوم ان کی حالت کو دیکھ کر رسول کریم ﷺ خاص طور پر بُلا کر انہیں احکام حرمت سنوایا کرتے تھے۔ سوم باوجود اس کے وہ باز نہ آتے اور یہی کہتے جاتے تھے کہ خدایا حرمت شراب کے حکم کو اور بھی واضح کر۔ مجھے ہفوات کے مصنف پر تعجب ہے کہ وہ صریح کلام کی موجودگی میں ہمیشہ اُلٹی چال چلتے ہیں اور غلط معنے ہی لیتے ہیں اصل حدیث کو دیکھ کر کوئی شخص ایک منٹ کے لئے

بھی نہیں خیال کر سکتا کہ حضرت عمر کو شراب کی عادت تھی اور وہ اسے چھوڑتے نہ تھے اس لئے ان کو احکام سنائے جاتے تھے مگر وہ پھر بھی نہ مانتے تھے بلکہ الفاظ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر شراب کے مخالف تھے اور ان کے اس شوق کی وجہ سے رسول کریم ﷺ ان کو شراب کے متعلق آیات سنایا کرتے تھے مگر چونکہ اس وقت تک قطعی حکم ممانعت کا نہ آیا تھا حضرت عمر خواہش کرتے کہ کاش اس سے بھی واضح الفاظ میں شراب حرام کی جائے تاکہ کوئی شخص اس کے قریب بھی نہ جائے۔ چنانچہ حدیث یہ ہے۔ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَنَّہٗ قَالَ اَللّٰھُمَّ بَیِّنْ لَنَا فِی الْخَمْرِ بَیَانَ شِفَاءٍ فَنَزَلَتِ الَّتِیْ فِی الْبَقَرَۃِ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ۔ فَدُعِیَ عُمَرُ فَقُرِأَتْ عَلَیْہِ فَقَالَ اَللّٰھُمَّ بَیِّنْ لَنَا فِی الْخَمْرِ بَیَانَ شِفَاءٍ فَنَزَلَتِ الَّتِیْ فِی النِّسَآءِ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی۔ فَدُعِیَ عُمَرُ فَقُرِأَتْ عَلَیْہِ ثُمَّ قَالَ اَللّٰھُمَّ بَیِّنْ لَنَا فِی الْخَمْرِ بَیَانَ شِفَاءٍ فَنَزَلَتْ الَّتِیْ فِی الْمَآئِدَۃِ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ اِلٰی قَوْلِہٖ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ۔ فَدُعِیَ عُمَرُ فَقُرِأَتْ عَلَیْہِ فَقَالَ اِنْتَھَیْنَا اِنْتَھَیْنَا۔[۴۱] یعنی عمر بن الخطاب کی روایت ہے کہ آپ نے کہا کہ اے اللہ ہمارے لئے شراب کا مسئلہ اس طرح بیان کردے کہ پھر اور حاجت نہ رہے اس پر سورۃ بقرہ کی آیت یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ (تجھ سے شراب اور جوئے کے متعلق دریافت کرتے ہیں تُو کہہ دے کہ ان سے پیدا ہونے والا گناہ ان کے نفع سے زیادہ ہے) نازل ہوئی اس پر عمر کو بُلایا گیا اور انہیں یہ آیت پڑھ کر سنائی گئی مگر انہوں نے اس آیت کو سن کر پھر بھی یہ کہا کہ اے اللہ! ہمارے لئے شراب کے متعلق کوئی ایسا حکم دے جو بالکل واضح ہو کہ کسی تاویل کی گنجائش نہ ہو اس پر سورۃ نساء کی یہ آیت نازل ہوئی کہ اے مؤمنو! جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ اس پر عمر کو پھر بلایا گیا اور یہ آیت سنائی گئی مگر آپ نے پھر یہی کہا کہ اے خدا! کوئی واضح حکم جس کے بعد تاویل کی گنجائش نہ رہے شراب کے بارہ میں بیان کر۔ اس پر مائدہ کی یہ آیت اُتری کہ شیطان تو شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تم میں عداوت اور بُغض ہی پیدا کرنا چاہتا ہے اور اللہ کی یاد سے اور نماز سے روکنا چاہتا ہے پھر کیا تم (شراب اور جوئے سے) باز آؤ گے؟ (یا نہیں؟) اس پر حضرت عمر نے کہا اب ہم باز آگئے ہم باز آگئے۔

اس حدیث کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عمر شراب کے مخالف تھے کیونکہ حدیث میں صاف بیان ہے کہ جس وقت شراب کے متعلق ابھی کوئی حکم نہ آیا تھا اس وقت حضرت عمر دعا

کیا کرتے تھے کہ خدایا شراب کے متعلق کوئی حکم نازل فرما۔ اگر وہ شراب کے خواہشمند تھے تو انہیں اس دعا کی کیا ضرورت تھی؟ شراب تو پہلے ہی ملک میں رائج تھی اور سب لوگ اس کو استعمال کرتے تھے پھر اس کی حلت کے لئے دعا کرنے کی انہیں کیا ضرورت تھی؟ جو چیز ملک میں پہلے ہی سے رائج ہو اور اس سے منع نہ کیا گیا ہو کیا اس کا مشتاق یہ دعا کر سکتا ہے کہ خدایا اس کے بارہ میں کوئی واضح حکم دے۔ یہ دعا تو صرف وہی کر سکتا ہے جو اس چیز کو رُکوانا چاہتا۔ پس جب کہ شراب کی ممانعت نہ خدا تعالیٰ کی طرف سے تھی نہ رسول کی طرف سے تو حضرت عمر کا خدائی حکم کے لئے دعا مانگنا صاف بتاتا ہے کہ آپ اس کے حرام کئے جانے کی دعا کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ جب ایک آیت اس بارہ میں اُتری تو رسول کریم ﷺ نے خاص طور پر انہیں بلا کر سنائی تا انہیں خوشی ہو کہ میری خواہش اللہ تعالیٰ کی مرضی کے ساتھ مل گئی۔ مگر چونکہ ملک میں شراب کا بہت رواج تھا حضرت عمر سمجھتے تھے کہ شراب اس طرح نہ رُکے گی۔ انہوں نے پھر دعا کی کہ خدایا اسے اور واضح کر۔ اس دفعہ کی دعا سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ شراب کے مخالف تھے کیونکہ جب خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ شراب میں نقصان زیادہ ہے تو اور بھی وضاحت کی خواہش کے یہی معنے ہیں کہ صرف یہ نہ فرما کہ اس میں نقصان ہیں بلکہ اس کو منع فرما۔ اگر وہ شراب کی تائید میں ہوتے تو اس موقع پر چاہئے تھا کہ یہ دعا کرتے کہ اے خدا! شراب کی خوبیاں بیان فرما اور اس آیت کو منسوخ کر دے مگر وہ تو وضاحت چاہتے ہیں اور بُری چیز کے متعلق حکم کی وضاحت اس کی حرمت کے ذریعہ سے ہی ہو سکتی ہے۔ جب ایک اور آیت نازل ہوئی کہ نشہ کے وقت نماز کے قریب نہ جاؤ (میں ان معنوں کو حدیث کے الفاظ کی بناء پر لے رہا ہوں ورنہ میرے نزدیک اس آیت کے معنی بالکل اور ہیں) تو پھر آپ نے وہی خواہش ظاہر کی کہ اس سے بھی واضح حکم ہو۔ آخر صاف الفاظ میں جب ممانعت ہوئی تو آپ کی تسلی ہو گئی۔ غرض الفاظ حدیث واضح طور پر بتاتے ہیں کہ حضرت عمر شراب کے مخالف تھے اور یہ جو آخر حدیث میں لفظ ہیں کہ ہم باز آگئے باز آگئے ان سے مُراد خود حضرت عمر نہیں بلکہ مسلمان بحیثیت قوم ہیں اور ان الفاظ کے یہ معنے ہیں کہ اب ہماری قوم باز آجائے گی کیونکہ حکم صاف طور پر نازل ہو گیا ہے اور اب کسی کو تاویل کی گنجائش نہ رہے گی ورنہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ جو شخص شراب کی حرمت کی خواہش رکھتا ہو وہ خود شراب پیتا ہو اور باز آجانے سے اس کی مراد اپنا نفس ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس جواب سے ہر شخص پر مصنف ہفوات کے اعتراض کی لغویت ظاہر ہو جائے گی۔ اور جو ان کی دھمکی ہے کہ حضرت عمر کے باز نہ

آنے پر جو کچھ ہوا اسے ہم آگے بیان کریں گے۔ میں بھی اِنْشَاءَ اللّٰہ اسی موقع پر ان کے اس بیان کی قلعی کھولوں گا۔ وَالتَّوْفِیْقُ مِنَ اللّٰہِ

---

۱ تاریخ احمدیت جلد ۵ صفحہ ۵۵۶ مطبوعہ ۱۹۶۴ء

۲ متی باب ۷ آیت ۱۷ تا ۲۰ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور مطبوعہ ۱۹۵۶ء

۳ الاعراف: ۱۵۷ ۴ القارعة: ۱۰ ۵ هود: ۱۰۹

۶ التین: ۷

۷ کنز العمال جلد ۱۴ صفحہ ۵۲۷ روایت نمبر ۳۹۵۰۶ مطبوعہ حلب ۱۹۷۵ء میں حدیث کے الفاظ یہ ہیں "یاتی علی جهنم یوم ما فیها من بنی ادم احد تخفق ابوابها"۔

۸ التحریم: ۱۲، ۱۳ ۹ الزخرف: ۵۸

۱۰ جالینوس GALENOS (۱۳۰ء-۲۰۰ء) نامور طبیب، جراح اور طبی کتابوں کا مصنف۔ طب کی تعلیم کے لئے سمرنا اور اسکندریہ کا سفر اختیار کیا۔ اس نے انسانی جسم کے اندرونی اعضاء کا مطالعہ کیا اور تشریح الابدان (ANATOMY) اور افعال الاعضاء (PHYSIOLOGY) کی بنیاد رکھی اس نے ارسطو کے نظریات کی بھی نفی کی۔ (اردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد ۱ صفحہ ۴۴۴ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷ء)

۱۱ سقراط SOCRATES (۳۹۹-۴۶۹ق م) ایتھنز کا یونانی فلسفی جس کا شمار عموماً دانشور ترین لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس نے نوجوانوں کا ایک گروہ اپنے گرد جمع کیا اور ان میں تحقیق و جستجو کی ایسی روح پھونکی جو انہیں علم و انصاف کی طرف لے جانے والی تھی .... موجودہ معلومات کی حد تک اس نے خود کچھ نہیں لکھا۔ اس کی تعلیمات افلاطون، ارسطو اور ریوفن کے وسیلے سے ہم تک پہنچی ہیں۔ (اردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد ۱ صفحہ ۷۶۳ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷ء)

۱۲ افلاطون PLATO (۳۴۷-۴۲۷ق م) یونانی فلسفی، دنیا کے نہایت ذی اثر اور بارسوخ مفکروں میں شمار ہوتا ہے۔ سقراط سے تعلیم حاصل کی۔ اس کا فلسفہ مکالمات کی شکل میں بیان ہوا ہے جو اسلوب بیان کی حسن و خوبی نیز فکر و نظر کی گہرائی اور وسعت خیال کے اعتبار سے عالمی ادب کے شاہکار مانے جاتے ہیں۔ جمہوریت (REPUBLIC) افلاطون کی مشہور ترین تصنیف ہے جس میں ایک مثالی حکومت کا نقشہ سامنے رکھ کر بخشش و انصاف کا عملی مظاہرہ

کیا گیا ہے۔ (اردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد ۱ صفحہ ۱۱۲ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷ء)

۱۳؎ بو علی سینا (۹۸۰ء۔ ۱۰۳۷ء) ایشیاء کا جامع العلوم طبیب، فلسفی اور ماہر ریاضیات۔ انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی جن میں "القانون" اور "الشفاء" کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ (اردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد ۱ صفحہ ۵۱ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷ء)

۱۴؎ مسلم کتاب الایمان باب بیان الکبائر واکبرھا۔

۱۵؎ سنن نسائی کتاب عِشرۃ النساء باب حب النساء۔

۱۶؎ النمل: ۲۴ ۱۷؎ البقرۃ: ۱۶۶ ۱۸؎ التوبۃ: ۲۴

۱۹؎ البقرۃ: ۱۷۸ ۲۰؎ ص: ۳۲ تا ۳۴ ۲۱؎ الحشر: ۱۰

۲۲؎ الروم: ۲۲

۲۳؎ سنن نسائی کتاب عشرۃ النساء باب حب النساء

۲۴؎ لسان العرب جلد ۳ صفحہ ۷ زیر لفظ "حب" مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۹۸۸ء

۲۵؎ القصص: ۵۷ ۲۶؎ الانعام: ۱۶۳ ۲۷؎ یوسف: ۳۴

۲۸؎ بخاری کتاب المغازی باب احد یحبنا و نحِبہ

۲۹؎ لسان العرب جلد ۳ صفحہ ۸ زیر لفظ "حب" مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۹۸۸ء

۳۰؎ بخاری کتاب المرضیٰ باب فضل من ذھب بصرہ

۳۱؎ ۱۔ تیمتھیس باب ۲ آیت ۱۲ پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۹۴ء

۳۲؎ البقرۃ: ۲۲۹

۳۳؎ مسلم کتاب الصلوٰۃ باب نھی من اکل ثوما او بصلا او کراثا او نحوھا اس باب کے تحت دو مختلف روایتوں میں یہ الفاظ مل جاتے ہیں۔

۳۴؎ تا ۳۷؎ فروع کافی جلد ۲ کتاب النکاح باب حب النسا. مطبوعہ نولکشور ۱۸۸۶ء

۳۸؎ فروع کافی جلد ۲ کتاب النکاح باب غلبۃ النسا. مطبوعہ نولکشور ۱۸۸۶ء

۳۹؎ جواب الکافی صفحہ ۱۸۷ مطبوعہ بار اول مطبع الخلیلی آرہ انڈیا

۴۰؎ بخاری کتاب التفسیر باب تبتغی مرضاۃ ازواجک قد فرض اللہ لکم تحلۃ ایمانکم

اس التحریم :۵ ۴۲ التحریم :۱۱ ۴۳ المائدۃ :۶۱

۴۴ المزمل :۱۴

۴۵ اقرب الموارد جلد ۲ صفحہ ۸۷۴ زیر لفظ "غمص" مطبوعہ قم ایران ۱۴۰۳ ھ ق

۴۶ المجادلۃ :۱۵ ۴۷ النسا :۹۴ ۴۸ الفتح :۷

۴۹ الفاتحۃ :۷ ۵۰ الاعراف :۱۹۸ ۵۱ الاعراف :۱۵۱

۵۲ الاعراف :۱۵۵ ۵۳ الانبیا :۸۸ ۵۴ الشوریٰ :۳۸

۵۵ بخاری کتاب النکاح باب موعظۃ الرجل ابنتہ لحال زوجھا

۵۶ یوسف :۹

۵۷ ابن ماجہ کتاب الدعاء باب اسم اللہ الاعظم

۵۸ الاعراف :۱۸۱

۵۹، ۶۰ ابن ماجہ کتاب الدعاء باب اسم اللہ الاعظم

۶۱ ھود :۷۴

۶۲ بخاری کتاب الاشربۃ باب الشرب من قدح النبی صلی اللہ علیہ وسلم و انیتہ

۶۳، ۶۴ بخاری کتاب الطلاق باب من طلق و ھل یواجہ الرجل امراتہ بالطلاق

۶۵ البقرۃ :۲۳۸ ۶۶ الاحزاب :۵۱

۶۷ فروع کافی جلد ۲ صفحہ ۱۷۶، ۱۷۷ کتاب النکاح باب اخر منہ مطبوعہ نولکشور ۱۸۸۶ء

۶۸ النور :۲۷ ۶۹ مریم :۲۸، ۲۹ ۷۰ مریم :۳۰

۷۱ مریم :۳۱ تا ۳۵

۷۲ بخاری کتاب المغازی باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم و وفاتہ — "فامرہ" کا لفظ حاشیہ میں دیا گیا ہے۔

۷۳

۷۴ مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۳۸ حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں "قال انہ یھون علی انی رایت بیاض کف عائشۃ فی الجنۃ"۔

۷۵

۷۶ الشعراء:۴

۷۷ کشف الغمۃ عن جمیع الائمۃ جلد ۲ صفحہ ۸۷ مطبوعہ مصر ۱۹۵۱ء

۷۸ لقمٰن:۱۴

۷۹ طبقات ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۴۵ مطبوعہ ۱۳۲۱ھ میں روایت کے الفاظ اس طرح ہیں "و قد رایتھا فی الجنۃ لیھون بذلک علی موتی کانی اری کفیھا یعنی عائشۃ"

۸۰ اٰل عمران:۵۰ ۸۱ سبا:۱۴

۸۲ ابوداؤد کتاب الصوم باب الصائم یبلع الریق

۸۳ بخاری کتاب الصوم باب القبلۃ للصائم

۸۴ عون المعبود (شرح ابوداؤد) جلد ۲ صفحہ ۲۸۵ مطبوعہ ملتان ۱۳۹۹ھ

۸۵، ۸۶ فروع کافی جلد اوّل کتاب الصیام باب الرجل یجامع اھلہ فی السفر مطبوعہ لکشنور ۱۳۰۲ھ

۸۷ فروع کافی جلد اوّل کتاب الصیام باب الطیب الریحان للصائم

۸۸ مؤطا امام مالک کتاب الصیام باب ماجاء فی الرخصۃ فی القبلۃ للصائم

۸۹

۹۰

۹۱، ۹۲، ۹۳ فروع کافی جلد اول کتاب الصیام باب الصائم یقبل او یباشر مطبوعہ لکشنور ۱۳۰۲ھ

۹۴، ۹۵ لسان العرب جلد ۱ صفحہ ۴۱۳، ۴۱۴ زیر لفظ "بشر" مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۹۸۸ء

۹۶ فروع کافی جلد ۱ کتاب الصیام باب الصائم یقبل او یباشر لکشنور ۱۳۰۲ھ

۹۷، ۹۸، ۹۹ فروع کافی جلد ۱ کتاب الصیام باب فی الصائم یذوق القدور و یرق الفرخ مطبوعہ لکشنور ۱۳۰۲ھ

۱۰۰ فروع کافی جلد ۱ کتاب الصیام باب فی الرجل یمص الخاتم والحصاۃ والنواۃ مطبوعہ لکشنور ۱۳۰۲ھ

۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳ ابن ماجہ کتاب النکاح باب حسن معاشرۃ النساء.

۱۰۴؎ بخاری کتاب العیدین باب الحراب والدرق یوم العید
۱۰۵؎
۱۰۶؎ البقرۃ:۱۵۷
۱۰۷؎ تاریخ طبری جلد ۴ صفحہ ۳۰۳ مطبوعہ بیروت ۱۹۸۷ء
۱۰۸؎ البدایة والنهایة جلد ۷ صفحہ ۵۵ مطبوعہ بیروت ۱۹۶۶ء
۱۰۹؎ مشکوٰۃ کتاب الایمان الفصل الثالث
۱۱۰؎ العلق:۷ تا ۱۱ ۱۱۱؎ الشمس:۱۰، ۱۱ ۱۱۲؎ التین:۷
۱۱۳؎ القارعة:۷ تا ۱۰
۱۱۴؎ ترمذی ابواب التفسیر تفسیر سورۃ المائدۃ آیت انما یرید الشیطن ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضا.......